Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1968

سوچنے کی بات

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور
کچھ نچلے حصے میں رہے۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کیلئے اوپر گئے تو اوپر والوں
نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے
والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر ان نیچے
والوں کو (پانی دے کر) اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے
اگر انہیں (پانی دے کر) اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔ باب الفتن)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

Islam : A Challenge to Religion

(By Parwez)

The very name of the book strikes one as a paradox, for it is universally recognised that Islam is one of the religions of the world. So how could a religion challenge the very institution to which it subscribes ? The author has indeed made a successful bid to prove this strange aphorism for the first time in the history of Islamic thought and his research deserves careful study. It is thought-provoking; it is revolutionary, opening new vistas and bold horizons of intellectual endeavours. It is the outcome of life-long study of one of the renowned Quranic thinkers of our times.

The author has not, however, taken a purely negative attitude. Having proved his claim that Islam is NOT a religion, he has very lucidly explained what Islam really is, and how it offers the most convincing and enduring answers to those eternal questions which every thinking man asks about the meaning and purpose of life, and how it can be achieved. The book is thus a unique attempt at the rediscovery of Islam.

Scholarly written and exquisitely presented.

Bound - Rs. 25.00 Paper back - Rs. 16.00

(Postage extra)

Can be had from :

(1) IDARA-E-TOLU-E-ISLAM,
25-B, Gulberg II, LAHORE

(2) MAKTABA-E-DEEN-O-DANISH
Chowk Urdu Bazar, LAHORE

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

سالانہ ــــ پاکستان ــــ دس روپے

سالانہ ــــ ہندوستان ــــ پندرہ روپے

سالانہ ــــ غیر ممالک ــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان : ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

جلد (۲۱) | ستمبر ۱۹۶۸ء | نمبر (۹)

فہرست

(۱) یاد میں ــــــــــــ ۲

(۲) لمعات ــــــــــــ ۳

(۳) یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے ــــ (عنایت اللہ صاحب) ــــ ۹

(۴) رابطۂ باہمی ــــــــــــ ۲۲

(۵) نقد و نظر ــــ (حقیقتِ خلافت و ملوکیت) ــــ ۲۴

(۶) کیا ایسا جنسی اختلاط جائز ہے؟ ــــ ۲۵

(۷) باب المراسلات ــــ (قاریوں کے لطائف) ــــ ۳۳

(۸) دو اہم سوال ــــــــــــ ۳۸

(۹) ہماری تاریخ ــــ (علامہ تمنا عمادی صاحب) ــــ ۴۵

(۱۰) احادیث کا صحیح ترین مجموعہ ــــ (پرویز صاحب) ــــ ۵۷ - ۸۰

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس، ایبک روڈ۔ لاہور

یاد میں

(۱) پاکستان کی سرحدوں پر بسنے والے ان بے گناہ، مظلوم انسانوں، جنہیں بھارتی درندوں نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح بغیر کسی قسم کی آگہی یا اعلانِ جنگ کے، اُس وقت اپنی ہوس خون آشامی کا شکار بنایا جب وہ آرام سے اپنے گھروں میں سو رہے تھے۔ اور ستاروں کی آنکھوں کے علاوہ اس خونی منظر کا دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

(۲) ان معصوم بچوں کی، جنہیں مرہٹہ "بلوائیوں" اور سکھ "سورماؤں" نے اُچھال اچھال کر اپنی سنگینوں کی نوکوں سے چھلنی کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جنم کیوں لیا تھا۔

(۳) اُن عزت مآب دخترانِ ملت کی، جنہیں یہ انسان نما بھیڑیئے، ان کے صحن خانہ سے اُن نامعلوم ویرانوں کی طرف کشاں کشاں لے گئے جہاں سے پھر اُن کی آہ و فغاں تک کسی کو سنائی نہ دی۔

(۴) اور ــــ یاد میں

اُن غیور و جسور جوانانِ ملت کی جو ان بے پناہ مظالم کا بدلہ لینے کے لئے، شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں آ نکلے اور اپنی عدیم النظیر جرأت و بسالت سے دنیا کو دکھا دیا کہ حق کی خاطر جان دینے والے کیا کچھ کر دکھایا کرتے ہیں۔

اور ــــ چھمب، جوڑیاں، سیالکوٹ، چونڈہ، واہگہ، برکی، ہڈیارہ، سلیمانکی، راجستھان کے میدانوں کے ان ذرّات کی جو اپنی عالمتاب چمک دمک سے اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ خونِ شہداء کی رنگینی کس طرح حنابندِ عروسِ ملت ہوتی ہے۔

• لاکھوں سلام و صلوٰۃ ہوں اُن شہدائے امت اور مجاہدینِ ملت پر، جنہوں نے اپنی فقید المثال قربانیوں سے اس خطۂ زمین کو دشمن کی دستبرد سے محفوظ رکھا۔ جسے اسلام کی تجربہ گاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ س

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

(ب ب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

خاکِ شہیداں برگ ہائے لالہ می پاشم

قرآن کریم نے قصۂ آدم کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ قصہ ایک فرد یا ایک جوڑے کی داستان نہیں، یہ درحقیقت خود آدمی کی کہانی ہے جسے تمثیلی رنگ میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس داستان کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ جب آدم کا ہیولیٰ تیار ہوا تو خدا نے فرشتوں سے کہا کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ کیونکہ ہم نے اسے زمین میں صاحبِ اختیار بنایا ہے۔ جب فرشتوں کی معصوم نگاہوں نے اس پیکرِ خاک و آب پر غائرانہ نگاہ ڈالی تو انہیں اس میں آگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے بھی دکھائی دیئے۔ انہوں نے بحضور رب العزت عرض کیا کہ ہماری تو فطرت ہی تسلیم و رضا کی ہے اس لئے آپ کے حکم سے سرتابی تو کجا، ہمیں دل میں اس کا خیال تک بھی نہیں آ سکتا۔ لیکن اگر جرأتِ عرض معاف ہو، تو ہم اتنا معلوم کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ کیا اُسے زمین میں صاحبِ اختیار بنایا جا رہا ہے مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰)، جو اس میں خونریزیاں کرے گا اور فساد مچائے گا۔ جواب میں کہا گیا کہ تم سے جو کچھ کہا گیا ہے اُس کی تعمیل کرو۔ باقی رہا تمہارا خدشہ، سو اس کے متعلق ہم سردست اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۳۰)۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔

اب آپ آسمان کی بلندیوں سے نیچے اتر کر، زمین کی سطح پر آ جایئے اور ایک چھلتی ہوئی نگاہ ڈالئے آدمی (انسان) کی ساری تاریخ پر۔ یہ شروع سے اخیر تک، فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کا لرزہ انگیز اور عبرت خیز مرقع نظر آئے گا۔ یعنی اس داستان کا ایک ایک ورق، فرشتوں کے اس خدشہ کی تصدیق کرتا چلا جائے گا جس کا اظہار انہوں نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ اس سے یہی دکھائی دے گا کہ فرشتوں کی بات سچی تھی۔

پھر طرفہ تماشہ یہ کہ اس خون ریزی اور فساد انگیزی کو خود خدا بھی سندِ جواز عطا نہیں کرتا وہ اسے فرشتوں سے بھی آگے بڑھ کر، قابلِ مذمت قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی جان کی قیمت اتنی بڑی ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے بگوشِ ہوش سن رکھو کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادًا فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۳۲/۵) جس شخص نے کسی ایک جان کو بھی تلف کر دیا — بجز اس کے کہ وہ جرم قتل کی سزا کے طور پر ہو یا فساد مٹانے کے لئے —— تو یوں سمجھو جیسے اس نے تمام نوعِ انسان کو قتل کر دیا اس کے برعکس، مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۳۲/۵) جس نے کسی ایک متنفس کی بھی جان بچالی تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی۔

لیکن فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کی اسی تاسف انگیز داستان میں (جس کے پیشِ نظر فرشتوں کے اعتراض کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آتا)، ابنِ آدم کی تاریخ میں ایسے نقوش بھی سامنے آجاتے ہیں جو اِنِّيْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی جیتی جاگتی، درخشندہ و تابندہ، آسمان بوس و کہکشاں گیر، محکم دلیل بن جاتے ہیں اور نہیں دیکھ کر، ہر قلبِ حقیقت شناس بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ خمیرِ آدم میں جو کچھ نگۂ یزداں دیکھ رہی تھی، فرشتوں کی نگاہیں اس تک نہیں پہنچ پائی تھیں۔ یہی وہ "دعوئ خداوندی کو سچ کر دکھانے والے ابنِ آدم ہیں" جنکے ان محیر العقول کارناموں کو دیکھ کر خدا اور اس کے فرشتے، ہم آہنگ ہو کر بے ساختہ دادِ تحسین دیتے ہیں —— هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (۴۳/۳۳) کے الفاظِ خداوندی' اس تحسین و تبریک کی پائندہ شہادت ہیں۔

"آدم کے بیٹوں" میں سے یہ کون ہیں' جو نہ صرف آدم کو فرشتوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچاتے ہیں' بلکہ خود دعوائے خداوندی کی صداقت کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں' ان کے اسی کارنامہ شہادت (گواہی) کی بنا پر ارباب نظر نے "شہید" (سچا گواہ) کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن ان کی شہادت (گواہی)، نہ زبان سے چند الفاظ ادا کرنے سے پیشِ عدالت ہوتی ہے' نہ کاغذ پر روشنائی سے چند سطور لکھ دینے سے۔ یہ ظہور میں آتی ہے ان کے جانفروشانہ عزم و استقلال کے جذبہ کے اظہار سے اور لکھی جاتی ہے جریدۂ عالم پر ان کے قطراتِ خون سے۔ اور یہی وہ شہادت ہے جو انسانیت کی عظیم عدالت میں قابلِ پذیرائی سمجھی جاتی ہے۔

یہ وہ نہیں جو انسانیت کو تلف کرنے کے لئے' اپنی تلوار کو بے نیام کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں کہ جب ظلم و استبداد کی عفریتی قوتیں' انسانیت کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور مظلوم و مقہور، بیکس و بے بس' بے چارہ و بے سہارا انسانیت کسی کو مدد کے لئے پکارتی ہے' تو یہ اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے' سر بکف اور کفن بدوش آگے بڑھتے ہیں —— وَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (۱۱۱/۹)۔ اور مظلوم انسانیت کے سامنے سپر بن کر کھڑے ہو جاتے

ہیں۔ پھر یا تو ظالم کی کلائی مروڑ کر رکھ دیتے ہیں اور یا اس کشمکش میں اپنی جان دیدیتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ ۟ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ (۲/۱۵۷) انہی پر خدا صلوٰۃ وسلام بھیجتا ہے اور یہی ہیں جو اس راہ پر گامزن ہوتے ہیں جو کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ

> انہیں اس راستے میں بھوک، پیاس اور تکان کی جو تکلیف پہنچتی ہے یا ان کا جو قدم اس طرح اٹھتا ہے کہ وہ دشمن کے سینے پر ٹھوکر بن کر لگتا ہے، یا ان کی جو ضرب اعداء کے لئے ہمت شکن بنتی ہے، ان میں سے ایک ایک چیز "عملِ صالح" کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا صلہ خدا پر واجب ہو جاتا ہے۔ (۹/۱۲۰)

ان کا یہی جہاد ہے جسے "خدا تک پہنچنے کا وسیلہ" قرار دیا گیا ہے۔ (۵/۳۵) انہی کو اَعۡظَمُ دَرَجَۃً کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے (۹/۲۰) اور دوسرے لوگوں سے کہا گیا ہے کہ

> اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰہَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَ یَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ ۔ (۳/۱۴۲)
>
> کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمہاری طرف سے اس کا مظاہرہ ہی نہیں ہوا کہ تم میں سے کون سرکیف میدانِ کارزار میں آجاتا ہے اور کون اس راہ میں ثابت قدم رہتا ہے۔

اور یہی، اس معیارِ خداوندی پر پورے اترنے والے ہیں جن کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اَعَدَّ لَہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ (۹/۸۹)۔ ان کے لئے وہ جنتیں تیار رکھی ہیں جن کی شادابی و شگفتگی میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ یہی وہ ہیں کہ جب وہ اس طرح، حق کی راہ میں لڑتے، اپنی جان دے دیتے ہیں تو زندہ رہنے والوں سے پکار کر کہہ دیا جاتا ہے کہ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ۔ دیکھنا! انہیں کہیں مردہ نہ کہہ دینا۔ بَلۡ اَحۡیَآءٌ ۔ تم بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہو کہ تم زندہ ہو اور یہ مر چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندہ یہی ہیں جسے تم زندگی سمجھتے ہو وہ زندگی نہیں۔ وَ لٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ (۲/۱۵۴)۔ یہی نہیں کہ انہیں مردہ مت کہو۔ بلکہ انہیں اپنے دل میں بھی مردہ نہ سمجھو۔ وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا (۳/۱۶۹) جب انسانیت، مستبد درندوں کے نرغے میں آجائے، اس وقت جو اپنی جان کو سنبھال کر رکھتا ہے، معیارِ خداوندی کی رُو سے، وہ مردہ ہے۔ بلکہ مردوں سے بھی بدتر اور جو مظلوموں کی مدافعت کے لئے اپنی جان دے دیتا ہے، وہ حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اس حقیقت

کا شاہد بنتا ہے کہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اسی قسم کا ایک فیصلہ کن مرحلہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں اہل پاکستان کے سامنے آگیا تھا۔ اُس وقت سوال یہ تھا کہ حیاتِ بے شرف بسر کرنے کے لئے جان کو سنبھال کر رکھ لیا جائے یا مرگِ باشرف سے انسانی اقدار کی حفاظت کی جائے۔ ۶ ستمبر کی صبح وہ وقت آگیا تھا جس کے متعلق خود خدا پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اے پاکستان کے غیرت مند مسلمانو!

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (۴/۷۵)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ کیا تم سنتے نہیں ہو کہ کمزور و ناتواں، مظلوم و مقہور، مرد، عورتیں، بچے چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمارے لئے اس بستی سے نکلنے کی کوئی سبیل پیدا کر دے جس کے رہنے والوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے۔ ہمارے لئے اپنے ہاں سے کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے (جو ہمیں ان کے مظالم سے نجات دلائے)۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کو، واہگہ پار کے مظلوموں کی چیخ و پکار نے (جن پر بھارتی درندوں نے بغیر کسی قسم کی وارننگ یا الٹی میٹم دیئے محض دھاندلی سے اچانک حملہ کر دیا تھا) فضائے پاکستان میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی، ندائے جلال کی بے صوت صدا نے قرآن پاک کے مندرجہ بالا الفاظ سے دلوں کی بستیوں کو ہلا دیا۔ اُدھر سے یہ آواز کانوں میں پڑی، اور اِدھر سے مجاہدینِ پاکستان کے جیوش و عساکر، لبیک اللّٰھم لبیک کہتے ہوئے، دشمن کے بے پناہ سیلاب کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ مقابلہ اپنے سے کم از کم دس گنا سے ہے۔ لیکن اس حقیقت کا علم و احساس کہ اگر ان درندوں کو وہیں نہ روک دیا گیا تو ان کا اگلا قدم اہل لاہور اور سیالکوٹ کے گھروں کے صحن میں ہو گا۔ اور اس کے بعد ہم پر جو قیامت ٹوٹے گی اس میں ہمارا کچھ بھی تو باقی اور سلامت نہیں رہے گا۔ لہٰذا ان کے سامنے، سوال محض زندگی اور موت کا نہیں تھا۔ بے غیرتی کی زندگی جینے اور عزت کی موت مرنے کا تھا۔ انہوں نے ایک

لمحہ توقف کئے بغیر، مرگِ باشرف کو حیاتِ بے شرف پر ترجیح دی، اور عشق کی ایک ہی جست سے 'پروانہ وار' دشمن کی آگ میں کود گئے۔ اور اس کے بعد سترہ دن تک 'ان سجیلے جیالے' نوجوانوں نے وہ کچھ کرکے دکھایا کہ ایک طرف 'زمین پر بسنے والی اقوام عالم' فرطِ حیرت سے انگشت بدنداں تھیں، اور دوسری طرف آسمان کے فرشتے بحضور رب العزت عرض کناں کہ بارالہا! آپ نے جو پہلے دن فرمایا تھا کہ "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" ہمیں اس کا درخشندہ ثبوت مل گیا جس آدم کی ذریت میں اس قسم کے سرفروش وجاں سپار، جری اور بہادر، مجسمہ ہمت و استقلال، نیک طینت و پاکباز، مردانِ مجاہد پیدا ہوں، اسے مسجودِ ملائک و مخدوم کائنات ہونے کا حق حاصل ہے۔

یہی ہیں ارضِ پاکستان کے وہ پاسبان۔ یہی ہیں عزت و ناموسِ ملت کے وہ محافظ، یہی ہیں بلند ترین اقدارِ انسانیت کے وہ امین، یہی ہیں شرفِ احترام آدمیت کے وہ نگران جن کی یاد تازہ کرنے کے لئے، ۶ ستمبر کا دن ہر سال آتا ہے اور ہر سال آتا رہے گا۔ یہ آتا ہے ہمیں یہ یاد دلانے کے لئے کہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو نظرِ حقارت سے نہ دیکھو، کہ یہ تمہاری بیش بہا متاع ہیں۔

بچشمِ کم منگر عاشقانِ صادق را
کہ ایں شکستہ بہایاں متاعِ قافلہ اند

یہ آتا ہے یہ کہنے کے لئے کہ صحیح تعلیم و تربیت سے 'قوم کی اس متاعِ عزیز کی پوری پوری حفاظت کرو کہ۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

یہ آتا ہے اس حقیقت کو ہمارے سامنے بے نقاب کرنے کے لئے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

اس لئے یہ سمجھ کر مطمئن نہ ہو جاؤ کہ ہندو کا خطرہ ٹل چکا ہے۔ اس لئے ہمیں چین کی نیند سو جانا چاہیئے۔ یہ کشمکش ازلی ہے اور ابد تک رہیگی۔

یہ آتا ہے ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بتانے کے لئے کہ اس خطۂ زمین کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ بے بادہ شراب باقی نہیں رہا کرتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اس خطۂ زمین کا حصول اور استحکام مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے اس مملکت میں قرآنی نظام کی تشکیل۔ اس نظام کی اولین خصوصیت یہ ہوگی کہ اس مملکت کا کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہے گا اور میدانِ جنگ میں جان دینے والے سپاہی کو کبھا

کا مکمل اطمینان ہوگا کہ اس کے بعد آپ کے پسماندگان کسی کے محتاج نہیں ہوں گے۔ یاد رکھئے! یہی وہ اطمینان ہے جو انسان کو بے خل و غش خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے شیرِ مستاں بنا دیتا ہے۔

اور یہ دن آتا ہے ہمارے منہ پر طمانچہ مارنے کے لئے کہ تمہارے جیسی بے حس قوم بھی کوئی نہ ہوگی جس نے جنگ کے سترہ دن تو اس قدر بلند کیریکٹر کا مظاہرہ کیا اور اس کے بعد پھر انہی مفاد پرستیوں اور خدا فراموشیوں کی لعنت میں گرفتار ہو گئے جنہوں نے نہ کسی قوم کو زندہ رہنے دیا ہے۔ نہ تمہیں زندہ رہنے دیں گی۔ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو قیامت میں تمہارا گریبان ہوگا اور قوم کے ان قابلِ فخر شہیدوں کا ہاتھ جو یہ کہہ کر تمہیں بحضورِ داورِ داد ار رسوا کریں گے کہ

تم نے ہمارے خون کی لاج بھی نہ رکھی!

ادارۂ طلوعِ اسلام کی حیات افروز پیشکش

جہاد

جہاد کیا ہے؟

جہاد اور جنگ میں کیا فرق ہے؟

مومن اور مجاہد کس طرح مرادف الفاظ ہیں؟

قرآن کی رُو سے قوانینِ جنگ کیا ہیں؟

اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور اُنکے مدلل جواب

ایک مختصر لیکن جامع تصنیف — بصیرت افروز، حیات آموز

قیمت صرف — دو روپے فی جلد

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

حکایتِ ابلہ

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

[تقسیم ہند کے عواقب میں، ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے ہم پر جو قیامت خیز مظالم ہوئے ۔۔ وہ مظالم جن میں ہمارا مال و دولت اور جانیں ہی نہیں گئیں۔ ہماری عصمت و ناموس کو بھی بڑی درندگی سے لوٹا گیا ـــــ ہمارا احساس یہ تھا کہ ہمارے سینے کے یہ زخم کبھی مندمل نہیں ہوں گے۔ لیکن ہماری قوم نے جتنی جلدی ان انسانیت سوز واقعات کو فراموش کر دیا، اس کی مثال کسی اور قوم کی تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔

اس کے بعد ہماری ملی تاریخ میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے ساری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ واقعہ تھا ۱۹۶۵ء کی جنگ کا۔ اس میں انہی ہندوؤں اور سکھوں نے وہی کچھ دوبارہ کرنا چاہا جو انہوں نے تقسیم ہند کے زمانے میں کیا تھا۔ (بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ اس دفعہ وہ ہمارا نام و نشان تک مٹا دینے کے درپے تھے۔ ہماری قوم کے قابلِ فخر نوجوانوں نے اپنی جانیں دے کر جس طرح ہم سب کی جانیں ہی نہیں، بلکہ قوم کی عزت و ناموس اور عفت و عصمت کو محفوظ رکھا ـــــ ہمارا احساس یہ تھا کہ ہماری قوم (کم از کم) ان کے اس احسان کو فراموش نہیں کرے گی۔ لیکن ہمارا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا۔ قوم نے اسے اس طرح فراموش کر دیا گویا ـــــ وہاں بر چہرہ زخمے بود و بہ شُد ـــــ نتیجہ یہ کہ جس طرح ہمارے ہاں ۱۹۴۷ء کی قیامتِ صغریٰ کے صحیح واقعات کہیں محفوظ نہیں، اسی طرح، ہماری تاریخ کے اس عظیم واقعہ کی تفاصیل بھی کہیں ثبت نہیں کی گئیں۔ حتیٰ کہ ان کی کہانیاں بھی اب رفتہ رفتہ صدائے کُہن ہوتی جا رہی ہیں ـــــ اس میں (جہاں تک ہماری معلومات ہماری راہنمائی کرتی ہیں) صرف ایک استثناء ہے۔ اور وہ ہے عنایت اللہ کا دلِ درد آشنا اور قلم خونچکاں ۔ وہ تیس سال سے مسلسل کوچہ و بازار اور دشت و جبل میں برابر ان داستانوں کو دہراتے چلا جا رہا ہے کہ شاید اس سے قوم کی راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریاں پھر سے بھڑک اٹھیں۔ ذیل کی کہانی، عنایت اللہ کے اسی زریں سلسلہ دراز کی حیات افروز کڑی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک دفعہ عنایت اللہ انہی بھولی بسری کہانیوں کی تلاش میں، ریل میں سفر کر رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی ـــــ

عنایت اللہ صاحب آپ کہاں جا رہے ہیں —— ؟

اس کے بعد کیا ہوا۔ اسے خود انہی کی زبانی سنیئے۔ طلوعِ اسلام]

میں نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی تھی میں نے پہلی بار دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو میں نے کم ہی انسانوں میں کبھی دیکھی ہوگی۔ اس مسکراہٹ اور آنکھوں کی اس انوکھی سی چمک کے بغیر وہ بالکل عام سا انسان تھا —— مہنگائی اور معاشرتی خلفشار کا مارا ہوا پاکستانی جو سینے میں سو دکھ چھپا کر تصوروں میں مسکرانے کی کوشش کرتا رہتا ہے —— میں نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اس نے کہا۔ "آپ کے بیگ پر آپ کا نام لکھا ہے"۔

"میں راولپنڈی جا رہا ہوں"۔ میں نے اسکے سوال کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ "اور آپ؟"

"گوجرخان[1]"۔ اس نے کہا اور میں نے دیکھا کہ اس کی مسکراہٹ قدرے ماند پڑ گئی تھی کہنے لگا: "میں جنگِ ستمبر کے متعلق آپ کے سارے ہی مضامین پڑھ چکا ہوں اور باقاعدگی سے پڑھتا ہوں"۔ اس نے ذرا توقف سے پوچھا۔ "آپ جنگی کہانیاں کیوں لکھتے ہیں؟ ...... اس لئے کہ اس سے کچھ آپ کو فائدہ ہو یا آپ سچے دل سے پاک افواج کے کارناموں کو آنے والی نسلوں کے لئے لکھ رہے ہیں؟"

"آنے والی نسلوں کے لئے"۔ میں نے اُسے کہا۔

"کیا آپ نے کبھی جائزہ لیا ہے کہ لوگ کب تک یہ کہانیاں سنتے رہیں گے اور کب اُکتا جائینگے"؟ اس نے پوچھا۔ "کیا ایسا وقت بھی آئے گا جب قوم ان کہانیوں سے منہ موڑ لے گی؟"

"شاید نہیں"۔ میں نے کہا۔ "پاکستانی ایک غیور قوم ہے۔ کوئی بھی پاکستانی ان زخموں کو نہیں بھول سکتا جو اس نے دشمن کے ہاتھوں کھائے ہیں۔ پاکستانی اپنی اُن بہو بیٹیوں کو بھی نہیں بھول سکتے جو دشمن کی درندگی کا شکار ہو گئیں اور پاکستانی اپنے ان شہیدوں کو کیسے بھول سکیں گے جو ان ماؤں بہنوں کی آبرو پر قربان ہو گئے"۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح شہید ہوتے تھے؟" اس نے معصوم سے لہجے میں پوچھا۔ "آپ نے ان کی لاشیں دیکھی ہوں گی، انہیں اس وقت نہیں دیکھا ہو گا جب ان کی آخری سانس کے ساتھ ان کے سینے سے آخری نعرۂ حیدری نکلا تھا۔ اور اسی نعرے کے ساتھ ہی ان کی روح نکل گئی تھی .... میں نے انہیں دیکھا تھا"..... اس نے لمبی آہ بھری اور سوکھے ہوئے سے لہجے میں بولا: "میں نے ان کی لاشوں کو ان ہاتھوں سے اٹھایا تھا"۔

---

[1] خود عنایت اللہ گوجرخان کے رہنے والے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

[2] ہمیں امید ہے جو عنایت اللہ کے اس جنون کو قائم رکھے ہوتے ہے۔ (طلوعِ اسلام)

"آپ فوج میں ہیں؟"

"تھا" اس نے کہا۔ "سروس پوری ہو گئی ہے۔ خدا کا شکر ادا کیا کرتا ہوں کہ اس کی ذات نے ستمبر کی جنگ لڑنے کی سعادت عطا فرمائی تھی۔"

"آپ کون سے محاذ پر تھے؟"

"میں سارے ہی محاذوں پر تھا" اس نے مسکرا کر کہا۔ "محاذ ایک ہی تھا۔ ایک ہی سرحد تھی۔ راجستھان کا صحرا بھی ہمارا، ٹیٹوال کی وادیاں بھی ہماری تھیں۔ ہم جہاں جہاں لڑ رہے تھے اس جگہ کا ایک ایک انچ ہمارے لئے پورے پاکستان جتنا قیمتی تھا۔ اس ایک انچ سے پیچھے ہٹنے کو ہمارے جوان پورے پاکستان سے پیچھے ہٹ جانے کے برابر سمجھتے تھے۔ ان کے قدم جہاں جم گئے، جم گئے۔ وہاں سے ان کی لاشیں اٹھائی گئی تھیں ......" وہ چپ ہو گیا اور کچھ سوچ کر بولا۔ "آپ نے ایک جنگی واقعہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "وہ پیاسا شہید ہوا" ...... وہ واقعی سچا واقعہ تھا لیکن عنایت صاحب! پیاسا شہید ہونے والا وہی ایک نہیں تھا۔ سب پیاسے شہید ہوتے تھے۔ ان کی بوتلیں یا تو پانی سے بھری ہوتی تھیں اور انہیں پانی پینے کی مہلت نہیں ملی تھی یا ان کی بوتلیں بالکل خالی تھیں۔ کیونکہ محاذ پر پہنچنے کی جلدی میں وہ اپنے ساتھ پانی لے جانا بھول گئے تھے — مورچوں میں پانی بھی پہنچتا رہا تھا اور کھانا بھی لیکن پانی کا گھونٹ یا روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے ضمیر پر کچھ ایسا بوجھ محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ہم فرض کی ادائیگی کے دوران عیاشی کر رہے ہوں۔ جنگ ختم ہوئے اڑھائی برس گذر چلے ہیں لیکن میں اب بھی کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو ......" وہ چپ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو گئی تھیں اور وہ ریل کار کے پچھلے شیشے سے باہر دیکھنے لگا تھا اور میں اس کی آنکھوں کے تاثر سے اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ محاذ پر جا پہنچا ہے۔

اس نے ایک جھٹکے سے گردن میری طرف گھمائی اور پُر جوش لہجے میں بولا: "آپ کو ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ اس وقت تک آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ جسموں کی کہانیاں ہیں۔ آپ نے ابھی ان روحوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا جنہوں نے ان جسموں کے اندر بیٹھ کر انسانوں کو اسی طرح لڑایا تھا جس طرح انسان ٹینک میں بیٹھ کر ٹینک کو لڑاتا ہے۔ یہ بات بالکل سچ ہے جاتی جی! کہ انسان ٹینک بن گئے تھے لیکن ...... لیکن ......" وہ سوچ میں پڑ گیا اور ایسے انداز سے مسکرایا جیسے کسی سوال کا جواب نہ پا کر کھسیانا ہو گیا ہو۔ کہنے لگا: "میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ شاید آپ بتا سکیں کہ ان میں اتنی ہمت اور اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی؟ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کی ماؤں کے دودھ میں کوئی اثر تھا ......" اس نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ نے کسی شہید کی ماں کو کبھی دیکھا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں نے ایک شہید کی ماں کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے بیٹے کے تابوت کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا بیٹا راجستھان کے محاذ پر زخمی ہوا تھا۔ یہ سادھیوال کا آخری معرکہ تھا جو فائر بندی کے بعد لڑا گیا تھا۔

اس سیکٹر میں فائر بندی کے بعد معرکے لڑے گئے تھے کیونکہ پاکستان کی صحرائی فوج (ڈیزرٹ فورس) نے اس طرف سے دشمن کے سینکڑوں مربع میل پر قبضہ کر لیا تھا۔ دشمن نے اس علاقے کو چھڑانے کے لئے فائر بندی کے بعد بریگیڈ وں کی نفری سے حملے شروع کر دیئے تھے۔ اس کے پاس تو توپخانہ بھی تھا اور لڑاکا طیارے بھی لیکن ادھر انڈس رینجرز کے چند سو رائفل بردار اور ان کے ساتھ سندھ کے حُر تھے۔ نہ کوئی توپ نہ طیارہ۔ ڈیزرٹ فورس کے جوانوں نے ان تپتے ہوئے ریگزاروں میں نہ صرف دشمن کے بریگیڈوں کے حملے روکے بلکہ ان بریگیڈوں کو صحرا میں بکھیر کر جوابی حملے کئے اور دشمن کے دو ہزار مربع میل علاقے پر قابض ہو گئے۔

ساد ھیوال کا آخری معرکہ دشمن کی سرحد کے بیس میل اندر لڑا گیا تھا اور پاکستان کے صحرائی غازیوں نے دشمن کے سینے پر جا جھنڈا گاڑا تھا۔ یہ تو ایک معجزہ تھا جو ان غازیوں نے کر دکھایا۔ چھ سات سو رائفل برداروں نے پانچ ہزار کے بریگیڈ کا کم ہی کبھی مقابلہ کیا ہو گا۔ بھارت کے اس بریگیڈ میں سکھ لائٹ انفنٹری اور بمبے گرینیڈیرز جیسی چنی ہوئی پلٹنیں بھی تھیں۔ بھارتی حکمرانوں نے ان چنی ہوئی اور جنگ کی تجربہ کار پلٹنوں کو اس لئے اس بریگیڈ میں شامل کیا تھا کہ سادھیوال سیکٹر میں انڈین آرمی کی پسپائی سے بھارتی عوام میں ان کی ساکھ ختم ہو گئی تھی۔ وہ ہر قیمت پر اس سیکٹر سے پاکستان کی صحرائی فوج کو پیچھے دھکیلنا چاہتے تھے۔ اس بریگیڈ کی انہوں نے اس حد تک خاطر مدارات کی تھی کہ جس صبح پاکستانیوں نے سادھیوال پر جوابی حملہ کیا اس صبح پورے بھارتی بریگیڈ کے لئے بہت بڑے "کڑاہ" میں حلوہ پک رہا تھا۔

پاک صحرائی دستوں کے پاس اس روز پہلی بار مارٹر گنیں آئی تھیں ورنہ وہ ان کے بغیر لڑتے رہے تھے جب حملہ شروع کرنے سے پیشتر مارٹر گنیں فائر کی گئیں تو ایک گولہ "کڑاہ" میں جا گرا اور سارے بریگیڈ کا حلوہ ریت پر بکھر گیا۔ اس کے بعد ساڑھے چار گھنٹے چند سو مجاہدوں نے رائفلوں سے توپوں، مارٹر گنوں اور بھارتی بریگیڈ کی چار پلٹنوں (جن میں چنی ہوئی پلٹنیں بھی تھیں) کو ریگزار اور صحرائی ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں بالکل اسی طرح بکھیر دیا جس طرح وہ ان کے حلوے کو بکھیر چکے تھے۔ اور سادھیوال کی چوکی ان کے قبضے میں آ گئی۔

میں اس معرکے کے چند روز بعد اس محاذ پر گیا تھا۔ دشمن کی سینکڑوں لاشوں کو پاکستانی مجاہد ایک ہی جگہ دبا چکے تھے اور صحرائی لومڑیاں لاشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے جا رہی تھیں۔ دور دور تک ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں کئی لاشوں پہ وردی بھی نہیں تھی۔ صرف بنیان اور انڈر ویئر تھے۔ کیونکہ یہ سُورمے پاکستانی ڈیزرٹ فورس کے حملے کی شدت سے بوکھلا کر بھاگے تو صحرائی ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک گئے تھے۔ جانے کتنے دن یا کتنی دیر بھٹکتے رہے اور جسم سے وزن کم کرنے کے لئے انہوں نے رائفل، ایمونیشن بوٹ اور وردی بھی کہیں پھینک دی تھی۔ ان لاشوں پر کوئی زخم نہیں تھا، کوئی چوٹ نہیں تھی۔ وہ ریگزار میں پیاسے

مر گئے تھے۔ وہ بھٹک گئے تھے۔ یہی تھے بھارت کے وہ چنے ہوئے سورمے جو پاکستان کو فتح کرنے کے لئے حیدرآباد اور رحیم یار خان تک پہنچنے کے لئے آئے تھے۔

ہاں تو میں شہید کی ماں کی بات کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا اسی معرکے میں زخمی ہو کر ہسپتال آیا تھا۔ میں جس روز رحیم یار خان پہنچا اس روز قوم کا یہ بیٹا ہسپتال میں شہید ہو گیا تھا۔ اس کی میت تابوت میں رکھی تھی اور تابوت ہسپتال کے سامنے پڑا تھا۔ ہسپتال کی منڈیر پر پاکستان کا سبز جھنڈا بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔ شہید کی ماں تابوت کے پاس زمین پر بیٹھی تھی اور میں اس کے چہرے کو بڑے ہی غور سے دیکھ رہا تھا اور اس قابلِ صد احترام چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ماں کی آنکھیں خشک تھیں، ہونٹ بھینچے ہوئے اور چہرے پر ایسا تاثر تھا جسے میں سنجیدگی بھی نہیں کہہ سکتا تھا، متانت بھی نہیں، نہ میں اسے دکھ اور درد کہہ سکتا ہوں۔ میں اس تاثر کو بیان نہیں کر سکتا۔ ماں چپ چاپ تابوت کو دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھیں بھی نہیں جھپک رہی۔ دو چار لمحوں کے بعد اس نے ہولے سے سر اٹھایا اور اوپر منڈیر پر جھومتے سبز جھنڈے کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر اس مقدس جھنڈے کو تکتی رہی پھر آہستہ آہستہ نظریں نیچی کر کے اپنے بیٹے کے تابوت کو دیکھنے لگی۔

اب اس کے چہرے کا تاثر نمایاں اور قابلِ فہم تھا۔ وہ ایک ماں تھی جو اپنے جوان بیٹے کی لاش پر چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی ذات میں جو پاکستان کی جو عظیم ماں تھی وہ اسے رونے نہیں دے رہی تھی۔ اسکے چہرے کا تاثر صاف بتا رہا تھا کہ یہ ماں اس سبز جھنڈے کو دیکھ کر اندر ہی اندر فخر سے کہہ رہی ہے کہ اس پرچم کی ہریالی میں میرے جگر کا خون شامل ہے۔

"اور عنایت صاحب!" میرے ہم سفر نے میری بات سن کر کہا: "آپ کو معلوم ہے کہ ستمبر میں کتنے جگر کٹ گئے تھے جن سے ابھی تک خون ٹپک ٹپک کر اس پرچم کی ہریالی میں شامل ہو رہا ہے؟..

..... کسی کو معلوم نہیں۔ کبھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ لیکن بھائی جی! ایک بات ضرور ہے کہ ایک شہید کی ماں کو دیکھو تو لگتا ہے جیسے ہر شہید کی ماں کو دیکھ لیا ہے۔"

وہ پھر چپ ہو گیا۔ ریل کار حرکت ڈومیلی کی پہاڑیوں سے گزر رہی تھی اور وہ پیچھے ہٹتی چٹانوں، ریل کی پٹڑی اور درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، یا شاید اس کے ذہن میں کوئی بات آ گئی تھی جسے وہ یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"بہت سی باتیں ہیں جو کہی بھی نہیں جا سکتیں۔" اس نے کہا: "آپ فوجیوں کے کچھ زیادہ ہی ہمدرد معلوم ہوتے ہیں ورنہ آپ جنگی کہانیاں نہ لکھتے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ یہ کہانیاں حاصل کرنے کے لئے آپ کو

کتنا خوار ہونا پڑا ہوگا اور آپ کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہوں گے ...... لیجئے۔ ایک کہانی چلتے چلتے مجھ سے بھی سن لیجئے۔ بھائی جی! ستمبر کی جنگ عجیب و غریب طریقے سے لڑی گئی ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ ڈیڑھ ہزار میل لمبے محاذ پر کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ کہنے کو تو یہی کچھ ہے کہ ہم نے حملہ روک لیا تھا۔ لیکن کس طرح روکا؟ اس جواب کے اندر اتنی ہی کہانیاں ہیں جتنی پاک فوج کی نفری تھی۔ ہم بے شک منہ زور ہو کر لڑے لیکن کمانڈروں کی اسکیموں کو خراب نہیں ہونے دیا۔ ان کے حکم کی پوری پابندی کی۔ اس کے باوجود کئی موقعے ایسے بھی آئے جہاں ایک سپاہی کو اپنی "موو" کے متعلق خود فیصلہ کرنا پڑا۔ ہمارے ہر ایسے سپاہی نے وہی فیصلہ کیا جو ملک کی سلامتی کے لئے موزوں تھا۔ یہی فیصلے وہ کہانیاں ہیں جو میں چاہتا ہوں کہ تاریخ میں آجائیں۔ بھائی جی! ضرورت یہ ہے کہ کسی شہید کی جگہ جو نیا جوان پاک فوج میں بھرتی ہو تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ جس کی رائفل مجھے دی گئی ہے وہ شہید ہوا تھا اور اس رائفل یا شین گن سے اس نے وطن کی عزت بچائی تھی......

"بات یہ ہے عنایت صاحب! میں نے اپنے گاؤں کے ایک لڑکے کو فوج میں بھرتی کروایا تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی زمین خاصی ہے جو اس وقت بھی انہوں نے بٹائی پر دے رکھی ہے اور اب بھی بٹائی پر دی ہوئی ہے۔ یہ لڑکا باپ کے مرنے کے بعد آوارہ سا ہو چلا تھا۔ شہر دور نہیں تھا۔ اسے دراصل شہر کی سیر اور سینما کی لت پڑ گئی تھی۔"

"کہاں کا رہنے والا تھا؟"

"یہ نہ پوچھیے۔" اس نے کہا۔ "میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا نہ اس کے گاؤں کا نام۔ اچھا ہوا کہ آپ نے میرا نام نہیں پوچھا۔ میں اپنا نام بھی نہیں بتاؤں گا۔ آپ میری بات سن لیں پھر آپ خود ہی محسوس کریں گے کہ مجھے واقعی نام نہیں بتانا چاہیئے۔"

اس نے کہانی آگے چلاتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکے کو میں نے اپنے گروپ میں بھرتی کرایا تھا۔ ٹریننگ کے بعد وہ میری پلٹن میں آگیا۔ فوجی ٹریننگ نے اُسے خاصا سیدھا کر دیا تھا۔ لیکن پلٹن میں آکر وہ پھر سینما کا شوقین ہو گیا۔ میں اسے اکثر نصیحتیں کرتا رہتا تھا۔ مجھے زیادہ تر یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اچھا سپاہی نہیں بن سکے گا۔ بنیادی چیز ڈسپلن ہوتا ہے اس میں ڈسپلن کی بھی کچھ کمی تھی......"

"تین سال گذر گئے اور وہ دن آگیا جس دن کے لئے سپاہی کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔ خبر ملی کہ دشمن نے اعوان شریف پر گولہ باری اور شین گن فائرنگ کر کے ایک مسجد اور بہت سے لوگوں کو شہید کر دیا ہے۔ یہ لڑکا میرے پاس آیا۔ اسے جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تھی تو میرے پاس بھاگا آتا تھا۔ میں اس وقت حوالدار تھا۔ اسکی مشکلیں یہی

ہوتی تھیں کہ آج سیکشن کمانڈر سے تُو تُو مَیں مَیں ہوگئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ کمپنی کمانڈر کے پیش کروں گا یا یہ کہ رات ملٹری پولیس نے بازار میں پکڑ لیا تھا یا ایسی ہی باتیں ہوتی تھیں جو وہ مجھے آ بتاتا تھا تو میں اُسے دو چار گالیاں دیکر اور مل ملا کر اسے چھڑا لیا کرتا تھا۔۔۔۔"

"اس روز اعوان شریف پر بھارتی گولہ باری کی خبر سن کر بھی وہ میرے پاس آیا۔ خاصا پریشان تھا۔ پوچھنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟ میں نے بغیر سوچے کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوگا۔ اس نے اور زیادہ پریشان ہو کر پوچھا ہم جوابی فائر نہیں کریں گے؟ میں نے کہا کہ حکم ملا تو ضرور کرینگے۔ اس نے بے چین ہو کر کہا: استاد جی! ہم بے غیرت تو نہیں ہیں۔ دشمن گھر آ کر ہمارے بچوں کو مار جائے تو ہم پھر بھی حکم کا انتظار کرتے رہیں گے؟۔۔۔۔"

"وہ مجھے استاد جی کہا کرتا تھا۔ اعوان شریف پر دشمن کی گولہ باری سے اس کی جو حالت ہو رہی تھی اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے اپنے دشمن، اپنی سرحد اور اپنے فرض کو پہچان لیا تھا۔ سپاہی میں اسی وصف کی ضرورت ہے ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اس جیسے گھامڑ اور لاپرواسپاہی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگے گی۔ لیکن اس میں تو ایسی تبدیلی آئی کہ دو روز بعد اس کا سیکشن کمانڈر مجھے کہنے لگا۔ 'یار اپنے گرائیں کو تو نے کونسا تعویذ دیا ہے؟ بڑا "چٹک" ہو گیا ہے'۔۔۔ اس روز کے بعد وہ شام کے وقت میرے پاس آ بیٹھتا تھا اور جنگ کی ہی باتیں کہتا سنتا رہتا۔ ایک روز پوچھنے لگا کہ جنگ میں کوئی ہمیں فائر کرنے سے روکے گا تو نہیں؟

"اور چھب جوڑیاں کی فتح کے بعد جنگ چھڑ ہی گئی۔ ہماری پلٹن پہلے روز تو کھیم کرن سیکٹر میں تھی لیکن سیالکوٹ پر حملہ ہوا تو بہت سے ٹینکوں اور ہماری پلٹن کو سیالکوٹ بھیج دیا گیا۔۔۔۔۔ باتیں تو بڑی لمبی ہیں صاحب! میں آپ کو صرف اس جوان کا واقعہ سناتا ہوں ہم دونوں ایک ہی پلٹن میں تھے۔ کمپنیاں مختلف تھیں۔ کھیم کرن پر جوابی حملے کے دوران میں نے ایک روز موقع نکال کر اس سپاہی کے پلاٹون کمانڈر سے پوچھا کہ وہ کس حال میں ہے اور کیسے چل رہا ہے۔ اس کے پلاٹون کمانڈر نے کہا کہ جوان کمال کر رہے ہیں۔ کوئی بھی ڈھیلا نہیں۔ مجھے تسلی ہو گئی۔۔۔۔

"ہم دس تاریخ کی رات سیالکوٹ سیکٹر میں آ گئے۔ دشمن کا بہت زور تھا۔ کبھی تو ڈر لگتا تھا کہ سیالکوٹ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ کھیم کرن کا محاذ بھی کم ظالم نہیں تھا لیکن سیالکوٹ کی بات کچھ اور ہی تھی۔ جب میری پلٹن ایک ٹینک سکواڈرن کے ساتھ پھلورا کی طرف بڑھی تو ہم سمجھ گئے کہ دشمن پیچھے ہٹنے کے لئے نہیں آیا۔ اب ہم اسے یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ پیچھے ہٹنے کے لئے ہم بھی نہیں آئے۔ لیکن بھائی جی! وہ ٹینکوں کی جنگ تھی۔ انفنٹریاں یوں پس رہی تھیں جیسے لڑتے ہوئے بھینسوں یا سانڈوں کے درمیان دو تین بچے آ گئے ہوں۔ پہلی ہی ٹکر میں ہم نے دشمن کو پھلورا سے پیچھے تو ہٹا دیا لیکن بہت سی جانوں کی قربانی دے کر۔ پلٹن میں کئی جوان اور عہدیدار شہید ہو گئے جن کی جگہیں پُر کرنے کے لئے مجھے وہی پلاٹون دے دی گئی جس میں یہ سپاہی تھا جس کا میں واقعہ سنا رہا

ہوں۔ اس کا پلاٹون کمانڈر شدید زخمی ہو گیا اور ہسپتال میں شہید ہو گیا تھا ....."

"اسی رات مجھے حکم ملا کہ دس آدمیوں کی ایک ٹینک شکار پارٹی (TANK HUNTING PARTY) بھیجنی ہے۔ مجھے اس پارٹی کے ساتھ جانا تھا۔ رات کے وقت ٹینک اندھے ہو جاتے ہیں۔ شام ہوتے ہی ٹینکوں کو دور پیچھے لے جاتے ہیں تاکہ ٹینک شکار پارٹیوں سے محفوظ رہیں۔ اگر انہیں آگے ہی رکھنا ہو تو انفنٹری ان کی حفاظت کرتی ہے۔ چنانچہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنے چند ایک آدمی ٹینک شکن ہتھیاروں مثلاً راکٹ لانچر، دشمن کے مورچوں میں گھس جائیں اور ٹینکوں کو تباہ کر آئیں۔ اس مہم پر جانے والے زندہ واپس آنے کے لئے نہیں جایا کرتے۔ ذرا تصور کیجئے۔ دشمن کے مورچوں کے علاقے میں چلے جانا، جہاں دشمن ذرا سی آہٹ پر چوکنا ہو جاتا ہے۔ روشنی راکٹ فائر کر کے علاقے میں روشنی کر لیتا ہے اور مشین گنوں کی بوچھاڑیں فائر کرنے لگتا ہے، بارودی سرنگیں بھی بچھی ہوتی ہیں اور گھیرے میں آجانے کا خطرہ ہر لمحہ رہتا ہے۔ یہ تو دل گردے کا کام ہے۔ اگر پاک فوج کے جوان اس کام سے گھبرا جاتے تو ملک کا اللہ ہی حافظ تھا ....."

"میں اس رات دس جوانوں کا انتخاب کرنے لگا تو دانستہ اس جوان کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ مجھے اس پر بھروسہ نہیں تھا لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ 'استاد جی! میں بھی جاؤں گا'۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ پرانے سپاہیوں کا کام ہے۔ رات کے وقت ٹھکانے پر لانچر کا گولہ مارنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ تو جناب منت سماجت کرنے لگا اور میرے گھٹنوں کو چھو کر کہا۔ 'استاد جی! ساری عمر احسان مند رہوں گا۔ مجھے ساتھ لے چلو' ..... ہم میں سے کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ اس کی ساری عمر بس یہی چند گھنٹے ہیں۔ میں نے اسے ساتھ لے لیا۔ چلنے لگے تو بعض جوانوں نے جھک کر زمین کو چھوا اور انگلیاں چوم لیں۔ بعض نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ خدا سے گناہوں کی معافی مانگی اور فتح کی دعا کی۔ کسی نے کہا۔ 'اللہ بیلی شیرو! چلو' ....."

"اور ہم چل پڑے۔ رات چاندنی تھی۔ جب دشمن کی پوزیشنوں کے قریب پہنچے تو میں نے اپنے جوانوں کو آخری بار ہدایات دیں اور کہا کہ بکھر جاؤ، آڑ کا خیال رکھو، فائر کے لئے اور پیچھے نکلنے کے لئے میرے حکم کا انتظار نہ کرنا۔ قید ہونے کا خطرہ ہو تو ہتھیار برباد کر دینا۔ قید ہو جاؤ تو دشمن کو نام اور نمبر کے سوا کچھ نہ بتانا ....."

"آگے کماد کے کھیت تھے۔ خالی کھیتوں کی اونچی نیچی مینڈھیں بھی تھیں۔ جوان ایک دوسرے کو سلام دعا اور خدا حافظ کہہ کر بکھر گئے اور چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے خیال آیا کہ معلوم نہیں کہ ماؤں کے یہ سجیلے بیٹے میری نظروں سے تھوڑی دیر کے لئے اوجھل ہوتے ہیں یا ہمیشہ کے لئے۔ یہ خیال آیا اور ذہن سے نکل گیا۔ بھائی جی! میدانِ جنگ میں ایسی باتیں سوچنے والے لڑ نہیں سکتے ....."

"دشمن کے ٹینکوں کو ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ دراصل دشمن نے خود ہی ہماری مدد کر دی تھی۔ اسے

شاید کوئی شک ہوا تھا کہ اس نے یکے بعد دیگرے تین روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے۔ یہ دشمن کی نالائقی تھی۔ یہ پیرا شوٹوں والے راؤنڈ تھے جو کچھ دیر فضا میں معلق رہتے ہیں۔ ان کی روشنی میں مجھے دشمن کی پوزیشنیں اور ان کے پیچھے درختوں کے نیچے تین ٹینک کھڑے نظر آ گئے۔ فوراً تین چار مشین گنیں فائر ہوئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "تیرا آسرا میرے مولا، اپنے نام کی لاج رکھنا"۔ مجھے اپنے جوانوں کا فکر ہوا مگر ہم اس قدر دور دور تھے کہ ایک دوسرے کی خبر گیری بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دشمن کے فائر کئے ہوئے روشنی راؤنڈ نیچے آ گئے تھے۔ ان کی بجھتی روشنی اور پھیکی سی چاندنی میں مجھے کوئی ایک سو گز دور کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں لیٹا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف رینگنے لگا۔ وہ یقیناً میرا ہی کوئی جوان تھا۔ میں تیزی سے رینگتا ہوا اس تک پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنی فیلڈ پٹی کھول رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا کہ زخمی ہو گئے ہو؟ اس نے ہنس کر کہا۔ ہاں استاد جی! ذرا سا زخم ہو گیا ہے۔ وہ میرے گاؤں والا سپاہی تھا۔ اس کے لہجے سے مجھے شک ہوا کہ وہ تکلیف میں ہے اور زخم ذرا سا نہیں جیسا کہ اس نے کہا ہے۔ میں نے آگے ہو کر اس کی ٹانگ دیکھی تو اس کی پتلون کا رنگ گہرا لال ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ زخم کہاں ہے تو اس نے پہلے کی طرح ہنس کر کہا۔ "یہاں ہے۔ کوئی پروا نہیں استاد جی! ذرا سا زخم ہے۔ میں آگے جاؤں گا"۔۔۔

"میں نے اس کی پنڈلی پر ہاتھ رکھا تو میری انگلیاں گوشت میں دھنس گئیں میں لرز اٹھا۔ قریب ہو کے دیکھا تو اس کی پنڈلی کے چیتھڑے تار تار تھے۔ مشین گن کا پورا برسٹ (بوچھاڑ) اس کی دائیں پنڈلی سے گزر گیا تھا۔ ہڈی دیکھی، سلامت تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں نے اس کا زخم دیکھ لیا ہے تو اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور التجا کی کہ خدا کا واسطہ ہے تجھے استاد! مجھے پیچھے نہ بھیجنا۔ میں چل سکتا ہوں۔ میں نے اس کی پٹی اس کی پنڈلی پر کس دی۔ اوپر اپنی پٹی باندھ دی اور اسے کہا کہ وہ پیچھے چلا جائے۔ لیکن وہ رو پڑا اور کہنے لگا کہ استاد جی! میری بے عزتی نہ کراؤ۔ مجھے آگے جانے دو۔ سب کہیں گے کہ بزدل گولی کھا کر واپس آ گیا ہے۔۔۔۔۔

"وہ اٹھا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔ آگے کماد کا کھیت تھا۔ ہم اس کی منڈھ پر چلتے کھلے علاقے میں گئے تو لیٹ گئے۔ وہ اچھا بھلا میرے ساتھ رہا۔ اس کے منہ سے میں نے 'سی' بھی آن سنی کر دی۔ میں سرگوشیوں میں اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں دور سے دھماکہ ہوا اور دشمن کا ایک ٹینک جلنے لگا۔ میرے کسی جوان نے تُکا مار لیا تھا۔ ان شعلوں نے ہمیں اور شکار دکھا دیا۔ مجھ سے سات سو گز دور دو ٹینک کھڑے تھے۔ میں نے لانچر سیدھا کیا۔ شست لی اور فائر کر دیا۔ ایک اور ٹینک جلنے لگا۔ اس کے شعلوں نے جو منظر دکھایا وہ میرے لئے ناقابلِ یقین تھا۔ ہم دشمن کی مشین گن پوسٹ سے بمشکل پچاس گز دور تھے۔ ہماری آڑ اچھی تھی۔ اس مشین گن کی بوچھاڑیں چار اوپر سے چیختی ہوئی گزر رہی تھیں۔ مگر اندھا دھند کماد کے کھیت میں فائرنگ کر رہے تھے۔۔۔۔۔

"میرے زخمی ساتھی نے گرینیڈ نکالا تو میں نے اسے روکا۔ کیونکہ گرینیڈ پھینکنے کے لئے اسے کھڑے ہونا تھا۔

اور کھڑے ہو کر وہ دشمن کو نظر آسکتا تھا۔ ٹینکوں کے شعلوں نے دن کا منظر بنایا ہوا تھا۔ لیکن اُس نے میری نہ سُنی۔ اور کھڑے ہو کر گرینیڈ پھینکا اور اسی حرکت میں زمین پر پیٹ کے بل گرا۔ میری توقع کے خلاف گرینیڈ وہیں گرا جہاں اسے گرنا چاہیئے تھا۔ دشمن کی مشین گن ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی لیکن وہاں توپوں رجمنٹ تھی جس نے گولیوں کی بارش برسا دی۔ اسی قیامت میں دو اور دھماکے سنائی دیئے اور دو اور ٹینک جلنے لگے اور ان کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ تین چار ٹینک تیزی سے پیچھے جا رہے تھے۔ میں نے ایک اور راکٹ فائر کیا مگر خطا گیا۔

ہمارا مشن کامیاب تھا اب واپسی کی مہم تھی۔ ہم رینگ کر نکلے۔ کماد کے کھیت کے اندر نہ گئے کیونکہ دشمن اس میں زیادہ فائرنگ کر رہا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد ہم رینگتے رکتے، رینگتے رکتے چھ سات سو گز پیچھے آ گئے۔ دشمن نے اچانک مارٹر فائر شروع کر دیا۔ کون سی جگہ تھی جہاں مارٹر کا گولہ نہیں گر رہا تھا۔ دشمن کے پاس ایمونیشن کے ڈھیر تھے جو وہ اندھا دھند پھونک رہا تھا۔ ہم اسی آگ میں راستہ بناتے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ میرا ساتھی مجھ سے دس بارہ قدم دُور ہو گیا تھا۔ ایک گولہ اُس سے چھ سات گز پرے پھٹا اور میرا نوجوان غازی لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ میں دوڑ کر پہنچا۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اب وہ کبھی نہ اُٹھنے کے لئے گرا تھا۔ مارٹر گولے کے ٹکڑے نے اُس کا سینہ کھول دیا تھا۔ میں نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھا تو اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "استاد جی! میں مردں کا تو نہیں؟" میں نے اُس کا ماتھا چوم کر کہا۔ "نہیں گرائیں! تم زندہ رہو گے" اُس نے جھنجھلا کر کہا۔ "نہیں! میں پوچھ رہا ہوں، میں شہید ہوں گا نا، مروں گا تو نہیں؟"

"بھائی جی! میں نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیئے۔ مجھے اُس کی ماں کا خیال آ گیا۔ سوچا کہ اُسے کیا جواب دوں گا۔ وہ کہے گی کہ تم اُسے بھرتی کرانے لے گئے تھے، لاؤ میرا بیٹا واپس کرو۔ اتنی دیر میں اُس نے پھر پوچھا۔ "بولو نا استاد جی! میں شہید ہوں نا!" میں نے اُسے کہہ ہی دیا۔ "ہاں بچے! تم شہید ہو" اور میں اُسے اُٹھانے لگا تو اُس نے کہا۔ "نہ استاد جی! پیچھے نہ لے جاؤ، یہیں دفن کر دینا" اُس نے گرج کر نعرہ لگایا۔ "یا اللہ" اور وہ شہید ہو گیا .....

"یہ نعرہ سن کر میرے دو جوان اس طرف آ گئے۔ گولے برس رہے تھے۔ انہوں نے شہید کو دیکھا تو کہنے لگے کہ پیچھے لے چلتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ نہیں، اُس نے وصیت کی تھی کہ یہیں دفن کرنا۔ ایک جوان کے پاس رائفل تھی۔ اُس نے سنگین سے قبر کھودنی شروع کر دی۔ میں نے شہید کی رائفل اٹھالی اور سنگین سے زمین کا سینہ چیرنے لگا۔ ہم نے دو ڈیڑھ فٹ گڑھا کھود لیا۔ ہاتھوں سے مٹی ہٹاتے رہے اور شہید کو اس میں لٹا کر اوپر مٹی ڈال دی۔ مارٹر فائر رک گیا لیکن مشین گنیں چلتی رہیں اور گولیوں کے زناٹے ہمارے قریب سے گزرتے رہے ہم نے پیٹ کے بل لیٹ کر شہید کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور رینگتے پیچھے آئے۔ اس شہید کا نہ جنازہ اُٹھا، نہ جنازہ پڑھا گیا .....

"پھر صاحب! جنگ ختم ہوگئی اور پھر فوجیں سرحدوں سے بارکوں میں آگئیں۔ مجھے ایک ہی غم تھا کہ اس شہید کی ماں کو کیا جواب دوں گا، وہ تو اپنا بیٹا مجھ سے مانگے گی۔ میں نے اسے خط لکھ دیا تھا لیکن اس کا جواب نہیں آیا تھا جس سے میں اور زیادہ ڈر گیا کہ وہ مجھ سے ناراض ہوگئی ہے۔ میں جلدی چھٹی نہ جا سکا کیونکہ ہسپتال میں تھا وہاں زیادہ عرصہ رہنا پڑا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا "آپ زیادہ زخمی تھے؟"

"نہیں!" اس نے ٹالتے ہوئے کہا "زخم معمولی تھا۔ ڈاکٹر نہیں چھوڑ رہے تھے۔ خیر۔ مجھے اپنے زخموں کا تو کوئی غم نہ تھا۔ ہسپتال سے نکلتے ہی مجھے لمبی چھٹی مل گئی۔ میں ڈرتے ڈرتے گاؤں گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں شہید کی ماں کا سامنا کس طرح کروں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر زمین و آسمان ایک کر دے گی۔ لیکن بھائی جی! میں جب اس عظیم ماں کے سامنے جا کھڑا ہوا تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہ ماں ہے جس کا جوان بیٹا مر گیا ہے اور جس کی اس نے میت بھی نہیں دیکھی۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ اور میرے سر کو چومنے لگی۔ میری ہچکیاں نکل گئیں اور میں جی بھر کے رویا۔ بھائی صاحب! پاک فوج کا سپاہی رویا نہیں کرتا۔ وہ آنسو نہیں خون بہایا کرتا ہے ہم نے جانے کتنے شہیدوں کو دفن کیا ہے لیکن آنکھ میں آنسو کبھی نہیں آیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کہہ رکھا تھا کہ مر جائیں تو چپ کر کے کہیں دفن کر دینا۔ منہ سے آہ نہ نکلے۔ مگر اس روز میں بچوں کی طرح رویا ....."

"جب جی ذرا ہلکا ہوا تو میں نے شہید کی ماں کو دیکھا مجھے بڑی شرم آئی۔ وہ عورت ذات اور ماں چپ چاپ تھی، نہ آنکھ میں آنسو نہ زبان پہ فریاد۔ وہ اندر گئی اور ایک کاغذ اٹھا لائی۔ میں نے پڑھا۔ یہ شہید کا تھا جو اس نے ہر ستمبر کو لکھا تھا کہ میں شہید ہو جاؤں تو دودھ کی دھاریں بخش دینا تجھے اللہ پاک کی قسم ہے کہ رونا مت نہیں تو میری نیکی برباد ہو جائے گی....."

"خط پڑھ چکا تو ماں نے دکھیاری سی مسکراہٹ سے کہا کہ میں نہیں روؤں گی سینہ جل رہا ہے لیکن آنکھ میں آنسو نہیں آنے دوں گی..... اس نے اپنے بیٹے کے متعلق صرف اتنی سی بات پوچھی کہ وہ آگے شہید ہوا تھا یا کہیں پیچھے؟ میں نے اسے بتایا کہ وہ اتنا آگے شہید ہوا تھا جہاں کوئی مرد کا بچہ ہی جا سکتا ہے۔ ماں کے سینے سے لمبی آہ نکلی اور اس نے بڑے سکون سے کہا کہ اللہ تیرا شکر ہے۔"

اس کے بعد میں نے اسے سارا واقعہ سنایا لیکن اس کی شہادت تک۔ وہاں پہنچکر میں رک گیا تو اس نے پوچھا کہ اس کی قبر کس طرح کی بنائی تھی؟

میں نے یہ سن کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ زبان سے کچھ نہ کہا لیکن آنکھوں سے پھر آنسو ٹپکنے لگ گئے۔

معلوم نہیں وہ گاؤں کی سیدھی سادھی عورت کس طرح ساری بات سمجھ گئی۔ اس نے بڑے حوصلہ سے

کام لیا۔ اپنا ہاتھ اپنے سینے کی طرف لیگئی اور بھرپور لہجے سے کہا۔

کوئی بات نہیں۔ شہید کی اصل قبر اُس کی ماں کے سینے میں ہوتی ہے۔

(۰)

وہ خاموش ہو گیا لیکن میں اُس سے جنگ کے اور واقعات سننے کا خواہشمند تھا۔ اُس نے کہا کہ "جسے آپ کارنامے کہتے ہیں وہ ہمارے فرائض تھے۔ کون کونسا واقعہ سناؤں؟ اب تو ہم آپ کا کارنامہ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ہمارا کارنامہ؟"

"جی، آپ کا۔" اُس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: "ہم کم علم اور کم عقل لوگ تھے، دیہات کے رہنے والے کسان اور چرواہے۔ ہم پہ بازی آئی تو ہم نے بازی جیت لی جانیں بھی قربان کیں، آنکھیں بھی، ٹانگیں بھی اور بازو بھی۔ جو زندہ رہے وہ دکھ سے کہتے ہیں کہ ہم شہید نہ ہوئے۔ اب بازی آپکے سر ہے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپنے سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں۔ آپ عالم فاضل ہیں۔ آپ پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ پاک افواج نے جس ایثار سے اپنا فرض ادا کیا اسی ایثار سے ان کہانیوں کو ڈھونڈ کر آپ تاریخ میں ڈالدیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھے شاباش دیں۔ ہم نے جو کچھ کیا وہ ملک اور قوم کے نام پر کیا، اخباروں اور رسالوں کے لئے نہیں کیا، تمغوں اور انعاموں کے لئے نہیں کیا۔ لیکن ہمارے بعد آنیوالوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم سے پہلے جو گذر گئے ہیں وہ بہادر غیرتمند اور جانباز تھے۔ پاک فوج کے نئے سپاہی کو معلوم ہو کہ اسے جو ہتھیار دیا گیا ہے وہ ایک شہید کا ہے اور یہ بھی کہ وہ کسطرح بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہوا تھا۔ یہ کام آپ کا ہے۔ اب وقت یہ دیکھے گا کہ اس ملک کے کم عقل اور اَن پڑھ دیہاتی اچھے یا عالم فاضل قلمکار ..... ؟"

"جنگ میں سب سے زیادہ خوفناک ڈیوٹی او۔ پی (O.P) کی ہوتی ہے۔" اُس نے واقعہ سنایا۔ وہ دشمن کے منہ کے سامنے بیٹھ کر اپنے توپخانے اور مارٹروں سے دشمن کی دکھتی رگوں پر فائر کراتا ہے۔ دشمن سب سے پہلے 'او پی' کو ڈھونڈتا ہے اور اسے تباہ کرتا ہے۔ اگر گولے ٹارگیٹ پر نہیں گر رہے تو سمجھ لیجئے کہ 'او پی' بزدل ہے، کہیں چھپ کے بیٹھا ہے اور اندھا دھند فائر کرا رہا ہے۔ ہمارا ایک حوالدار ہے جو اب گھر چلا گیا ہے کیونکہ اُس کی بائیں ٹانگ شہید ہو گئی تھی۔ وہ ایک روز اپنی مارٹر پلاٹون کا 'او پی' تھا۔ دشمن کا بہت زور تھا۔ حوالدار بہت آگے نکل گیا اور جب اُس نے دشمن کی رگیں دیکھ کر فائرنگ کرائی تو دشمن کا زور ٹوٹنے لگا۔ لیکن حملہ پسپا نہیں ہو رہا تھا۔ حملے سے حوالدار نے ایسے ایسے گولے فائر کرائے کہ حملہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اتنے میں اس حوالدار کے قریب توپ یا مارٹر کا گولہ پھٹا جس سے اسکی بائیں ٹانگ کٹ گئی لیکن جسم سے الگ نہ ہوئی۔ اس حوالدار نے پرواہ نہ کی اور اسی جگہ سے دشمن کو دیکھ دیکھ کر فائر کروا تا رہا۔ گولے ٹھکانے پر جا رہے تھے۔ دشمن پیچھے ہٹنے لگا تو حوالدار کو اپنی پوزیشن بدلنی پڑی۔ وہ آگے رینگنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ کٹی ہوئی ٹانگ اسے پریشان کر رہی ہے۔ اُس نے زخم کا معائنہ کیا۔ ہڈی بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ پٹھے کٹ گئے تھے اور ٹانگ ایک طرف سے صرف کھال کے سہارے جسم سے لگی ہوئی تھی۔ حوالدار نے چاقو نکالا

اور ٹانگ کو جسم سے الگ کر دیا۔ پھر اپنی پیش شرٹ آناری اور زخم پر رکھ کر اوپر پٹیاں کس دیں .....

"تھوڑی دیر بعد دشمن پسپا ہو گیا لیکن داوپی، نہ واپس آیا نہ اس کے ساتھ وائرلیس کا ملاپ رہا۔ جا کے دیکھا تو وہ خون بہہ جانے سے بیہوش پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر پیچھے لے آئے۔ اللہ کا کرم ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اگر آپ اسے ملیں تو اسے ہر وقت ہنستا مسکراتا دیکھیں گے۔"

"وہ کس پلٹن کا تھا؟ کون تھا؟" میں نے پوچھا اور میں نے ہنس کر کہا۔ "وہ آپ ہی تو نہیں تھے؟"

"میری تو دونوں ٹانگیں سلامت ہیں"۔ اس نے ہنس کر کہا۔ آپ اس کے نام نمبر اور پلٹن کو چھوڑیئے۔ میں نے یہ واقعہ اس لئے سنایا ہے کہ آپ لکھ لیں۔ تاکہ فوجی پڑھیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ کامیاب 'اوپی' دشمن کی کمر کس طرح توڑ سکتا ہے۔"

اتنے میں ریل کار کی رفتار کم ہونے لگی۔ گوجر خان کا ریلوے اسٹیشن آ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ صبح کی ریل کار تو یہاں رکتی ہی نہیں۔ یہ گوجر خان کیسے اترے گا؟ پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے لاہور ڈرائیور سے کہہ دیا تھا کہ اسے گوجر خان اترنا ہے کہنے لگا۔ "آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ جنگ میں فوج اور ریلوے کی بڑی قریبی رشتہ داری ہوتی ہے۔ یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو ہم فوجی بہتے رہ جاتے ہیں۔ فوج اور ریلوے کو ایک دوسرے سے بہت پیار ہے۔ وہ مجھے گوجر خان اتار دے گا۔"

ریل کار رک گئی۔ میرا ہمسفر اٹھا۔ میں بھی اسکے ساتھ اٹھا۔ وہ ریل کار سے اترنے لگا تو دیکھا ڈرائیور اپنی سیٹ پر سے اتر کر ریل کار کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈرائیور نے ہاتھ بڑھایا اور میرے ہمسفر کا ہاتھ تھام لیا۔ جب وہ اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ دقت محسوس کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے سہارا دے کر اتارا۔ میں کود کر نیچے اترا اور اتفاق سے میرا ہاتھ اس کی بائیں ٹانگ پر پڑ گیا۔ وہ مصنوعی تھی۔

ڈرائیور اس سے ہاتھ ملا کر اپنی سیٹ پر چلا گیا اور ریل کار چل پڑی۔ چلتے چلتے میں نے اپنے ہمسفر سے پوچھا۔ "وہ حوالدار آپ ہی تھے نا؟"

قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا، گاڑی آگے نکل گئی۔

میں ریل کار کے پائیدان پر کھڑا تھا، اور وہ پلیٹ فارم پر کھڑا ہاتھ لہرا رہا تھا۔ ریل کار تیزی سے آگے نکل گئی اور میں اپنے جانباز ہمسفر کا ہلتا ہوا ہاتھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔ وہ میری پلکوں کے دھندلکے میں کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ جب خیال آتا ہے کہ مجھے اس کا نام پتہ معلوم نہیں تو میں جھنجلا کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کرتا ہوں کہ وہ کوئی اور تھا۔

(بقیہ)

رابطہ باہمی

بزم لاہور ارکانِ بزم پورے انہماک سے حسبِ معمول تحریکِ طلوعِ اسلام اور اس سے متعلق لٹریچر کی اشاعت کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانے کے لئے کوشاں ہیں۔ اسی طرح وہ محترم پرویز صاحب کے ہفتہ وار مرکزی درسِ قرآن کے سلسلہ نو کو جو گذشتہ مارچ میں شروع کیا گیا تھا، ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ مغربی پاکستان میں زیادہ سے زیادہ بزموں کو اس سلسلہ میں شامل کرنے کے کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ مقامی حلقہ درس میں روز بروز نئی صورتیں، بالخصوص نوجوانوں اور طلبا کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ارکان بزم ان سے رابطہ قائم کر کے انہیں تحریک کے مقاصد سے روشناس کرا رہے ہیں جس کے نتائج حوصلہ افزا ہیں۔

چونکہ طلوعِ اسلام کی گیارہویں کنونشن کے انعقاد کی تاریخیں مقرر ہو چکی ہیں اور یہ بزم ہر سال اس کی میزبانی کے فرائض کی انجام دہی کو باعثِ صد افتخار سمجھتی ہے اس لئے اراکین بزم نے اس سلسلے میں اپنی جدوجہد ابھی سے شروع کر دی ہے۔ امید واثق ہے کہ آئندہ کنونشن میں بزمہائے طلوعِ اسلام کے مندوبین و اراکین پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں شرکت فرمائینگے۔

بزم کراچی کے سرگرم اور مجاہد ارکان نے ۲۳ جون کو سندھ اسمبلی ہال میں عید میلاد النبیؐ کا شاندار جشن منانے کے بعد کراچی میں ہفتۂ عید میلاد النبیؐ منایا اور مختلف مقامات پر محترم پرویز صاحب کی تقریر "پیغام برائے انقلاب" نشر کیگئی اور ہر جگہ سامعین نے نہایت توجہ اور انہماک سے حصہ لیا۔

بزم کراچی نے جشنِ تکمیل درس کے سلسلے میں (جس کی رپورٹ ماہ جولائی کے شمارہ میں آچکی ہے) بزم کے اراکین کی طرف سے مفکرِ قرآن کو ایک TV سیٹ تحفۃً پیش کیا۔ کراچی میں نیا سلسلۂ درس شروع کرنے سے پہلے کئی ہفتہ تک سندھ اسمبلی ہال میں محترم پرویز صاحب کی خاص خاص موضوعات پر تقاریر ٹیپ پر پیش کر کے ایک نیا حلقۂ سامعین آراستہ کیا تاکہ جب درس کا نیا سلسلہ شروع ہو تو زیادہ سے زیادہ تشنگانِ قرآنی حقائق اس سے متواتر بہرہ اندوز ہو سکیں۔ چنانچہ اس مبارک سلسلہ کا ۲۱ جولائی سے کراچی میں آغاز کر دیا گیا ہے۔ بزم کی ہفتہ وار رپورٹوں سے مترشح ہوتا ہے کہ نئے سلسلۂ درس کے ٹیپ نہ صرف سندھ اسمبلی ہال میں سنائے جاتے ہیں بلکہ ہر ہفتہ کراچی کے ایک دو اور مقامات پر بھی یہ درس نشر کئے جا رہے ہیں۔

بزم کی تازہ رپورٹیں بتا رہی ہیں کہ کراچی کے ارکان نے اپنے مخصوص انداز میں کنونشن میں شمولیت کی تیاری ابھی سے شروع کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ارادوں اور کوششوں میں برکت عطا کرے۔

بزم راولپنڈی بزم کے زیر اہتمام ہفتہ وار ٹیپ درس کا سلسلہ الکوثر بلڈنگ میں باقاعدگی سے جاری ہے۔ ارکانِ بزم رسالہ طلوع اسلام کی اشاعت اور پیشگی خریداری کی اسکیم کی توسیع کے بارے میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔

بزم لائلپور ٹیپ کے ذریعہ محترم پرویز صاحب کا ہفتہ وار درس قرآن باقاعدگی سے جاری ہے۔ بزم کے ارکان سرگرمی سے تحریک کے فروغ کے کاموں میں وقت دے رہے ہیں۔ بزم کے نمائندہ محترم خان اکرم خان کی قیادت میں بزم نے نمایاں کارکردگی دکھلائی ہے۔ اب انکے رفیقِ کار محترم نذیر حسین عارف صاحب نمائندہ بزم منتخب ہوگئے ہیں۔ امید واثق ہے کہ وہ اپنے پیشرو کی روش پر قائم رہ کر بزم لائلپور کی شبانہ روز سرگرمیوں میں مزید اضافے کرتے رہیں گے۔ بزم نے ایک خاص تقریب پر محترم خان اکرم خان صاحب کو انکی خدمات پر ہدیہ تبریک پیش کیا ہے۔ اس شکریہ میں ادارہ ان کا ہم نوا ہے۔

بزم ملتان سلسلہ وار درس جواب سورۂ قلم کے آخر تک پہنچ چکا ہے۔ عمدگی سے چل رہا ہے جس میں سامعین کافی تعداد میں شامل ہوتے ہیں۔ لائبریری سے کتابیں اور لٹریچر بھی تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ارکانِ بزم تحریک کے کاموں میں دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں۔

بزم میانوالی تحریک کے فروغ کے لئے ارکانِ بزم کی کوشش بدستور جاری ہے۔ بزم کے نمائندہ محترم محمد شریف لون صاحب کی مساعی جمیلہ سے ایک اور بزم موضع بہل تحصیل بھکر (ضلع میانوالی) میں قائم ہو چکی ہے جس کے نمائندہ محترم منظور حسین خانصاحب ہیں۔ لون صاحب موصوف کا حلقہ اثر میانوالی تک ہی محدود نہیں ہے، حال ہی میں انہوں نے تحصیل خانیوال (ضلع ملتان) میں بمقام $\frac{39}{10.11}$ میں بھی محترم تصدق حسین شاہ صاحب کی سرکردگی میں ایک نئی بزم کے قیام کا بیڑا اٹھایا ہے۔

بزم سیالکوٹ محترم چودھری محمد دین صاحب کی والہانہ اور پُرخلوص کوششوں سے سیالکوٹ میں ہفتہ وار ٹیپ درس کا انتظام ہو چکا ہے۔ فی الحال محترم پرویز صاحب کی اہم تقاریر کے ٹیپ نشر کئے جاتے ہیں۔ عنقریب یہاں نئے سلسلۂ درس قرآن کا رابطہ قائم ہو جائے گا۔

دیگر بزمیں اپنی اپنی جگہ تحریک کے فروغ کے لئے اور اس کی آواز کو ملک کے گوشے گوشے تک پھیلانے کے لئے سعی و کاوش میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے نیک ارادوں میں برکت اور استقامت عطا فرمائے۔ اس وقت تو تمام بزمیں کنونشن میں شرکت کرنے اور اسے کامیاب بنانے کے سلسلہ میں مصروف سعی و عمل ہیں۔

نقد و نظر

حقیقتِ خلافت و ملوکیّت

مؤلفہ۔ محمود احمد عباسی صاحب۔ ناشر۔ مکتبۂ محمود۔ ۲۶ بی ایریا۔ لیاقت آباد (کراچی ۱۹)
ضخامت۔ ۵۶۶ صفحات۔ قیمت مجلد (سستا ایڈیشن جو ہمارے سامنے ہے) ۶/۷۵ روپے

"ہر فرعونے را موسےٰ" کا محاورہ تو بہت پرانا ہے لیکن اس کی تصدیق ہر زمانے میں مختلف پیکروں میں ہوتی ہے۔ ہمارے دور میں اس کی تصدیق، مسلمانوں کے نامور تاریخی محقق محترم محمود احمد عباسی صاحب کی ضربِ کلیمی سے ہو رہی ہے۔ مودودی صاحب نے اسلام کا جدید ایڈیشن وضع کرنے کے سلسلہ میں حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کے خلاف (معاذ اللہ معاذ اللہ) جو مہم جاری کر رکھی ہے۔ اس نے بہت سے ناواقفوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ لیکن خدا بھلا کرے عباسی صاحب کا جوان صاحب کا اس طرح تعاقب کرتے ہیں کہ انہیں بھاگنے کو راستہ نہیں ملتا۔ مودودی صاحب کا آخری "سیاہ کار" ان کی رسوائے عالم کتاب۔ خلافت و ملوکیت ہے۔ عباسی صاحب نے اسکا جواب لکھ کر انکی بے مائیگی اور علمی بددیانتی کی ایسی قلعی کھولی ہے کہ بایدوشاید۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کیلئے موجب بصیرت ہوگا جو عہد حضرت عثمانؓ کے صحیح واقعات اور صحابہ کبارؓ کی بلندی سیرت کا مطالعہ کرنا چاہے۔ ہم عباسی صاحب کی اس تالیف پر انہیں مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔

محترم پرویز صاحب کی نایاب کتابیں

محترم پرویز صاحب کی وہ کتابیں جو اب نایاب ہیں اور ادارہ طلوعِ اسلام کے سٹاک میں بالکل ختم ہیں، ہمارے پاس چند نسخے موجود ہیں۔ خواہشمند حضرات فوراً طلب فرمائیں ورنہ یہ بھی فروخت ہو جائینگے۔
کم از کم تیس روپے کی کتابیں منگواتے پر ڈاک خرچ ہمارے ذمہ ہوگا۔

(۱)	برقِ طور۔	۹/۰۰ روپے	(۵)	فردوسِ گم گشتہ۔	۸/۰۰ روپے
(۲)	شعلۂ مستور۔	۶/۰۰ "	(۶)	اقبال اور قرآن۔	۲/۰۰ "
(۳)	ابلیس و آدم۔	۸/۰۰ "	(۷)	طاہرہ کے نام۔	۲/۵۰ "
(۴)	من و یزداں۔	۱۰/۰۰ "	(۸)	قتلِ مرتد۔	۱/۵۰ "

ملنے کا پتہ
مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

کیا ایسا جنسی اختلاط جائز ہے؟

(ایک نہایت اہم سوال)

قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحبِ فکر و صاحبِ قلم بزرگ نے ایک نہایت اہم اور اس کے ساتھ ہی نہایت نازک سوال دریافت کیا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ:

ان کے ہاں ایک میاں بیوی میں ایسا اختلاف پیدا ہوا ہے جس نے ایک پیچیدہ صورت پیدا کر دی ہے۔ بیوی نہایت شریف، سمجھدار، تعلیم یافتہ اور متین اور سنجیدہ ہے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد اس نے دیکھا کہ اس میں اور اس کے شوہر میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ اس کے برعکس اس میں ایسی عادات خبیثہ ہیں جن سے ہر شریف انسان کی طبیعت ابا کرے۔ بیوی نے کافی عرصہ تک کوشش کی کہ اس شخص میں کچھ اصلاح ہو جائے لیکن بے سود۔ بالآخر اس نے خاوند سے کہا کہ ہمیں خوش اسلوبی سے الگ ہو جانا چاہیئے لیکن وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ بیوی نے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن عدالت نے قانونی نقطۂ نگاہ سے اس کے دلائل کو محکم نہ پایا اور نکاح کی تنسیخ نہ کی۔ اس پر اس نے تنگ آ کر خود ہی علیحدگی اختیار کر لی تو خاوند نے حقوقِ زناشوئی کی بازیابی (RESTITUTION OF CONJUGAL RIGHTS) کا دعویٰ کر دیا اور عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اب وہ محترمہ کہتی ہیں کہ ان حالات میں خاوند کے ساتھ جنسی اختلاط سے اس کے اندر عجیب قسم کی نفسیاتی الجھن پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی طبیعت مانتی ہی نہیں کہ اس قسم کا جبری اختلاط جائز قرار پا سکتا ہے۔ وہ یوں سمجھتی ہے جیسے اس کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ وہ پوچھتی ہے کہ اس قسم کے جنسی اختلاط کو کیا کہا جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ سوال کس قدر اہم اور نازک ہے۔ مُلّا کا تو صاف جواب ہوگا کہ جب تک نکاح منسوخ نہیں ہوتا، خاوند کو اختلاط کا حق حاصل ہے اور بیوی پر اس کے حکم کی تعمیل فرض ہے۔ لیکن وہ محترمہ قرآن کی عدالت سے جواب مانگتی ہے۔ اس جواب تک پہنچنے سے پہلے، ایک تمہید کی ضرورت ہے۔

نزولِ قرآن سے پہلے، مرد اور عورت کے تعلقات کی ایک صورت یہ تھی کہ مرد، عورتوں کو جنگ سے پکڑ کر لے آتے یا بازار سے خرید کر۔ اور پھر ان کے ساتھ جنسی اختلاط قائم رکھتے۔ اس عورت کو لونڈی کہا جاتا جو مالک کو چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتی تھی۔ یعنی اس کے ساتھ جنسی اختلاط بلا اس کی رضامندی کے ہوتا تھا۔ وہ اس کے لئے مجبور تھی۔ البتہ جب مالک کا جی بھر جاتا تو وہ اسے کسی دوسرے کو دے دیتا، یا فروخت کر دیتا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں عورت کو کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ کلی اختیار مرد کو تھا۔

یا یہ سلسلہ اپنے اپنے رسم و رواج کے مطابق، نکاح کے ذریعے قائم ہو جاتا۔ نکاح میں بھی عورت کی رضامندی محض رسمی ہوتی تھی۔ لیکن یہ رسمی رضامندی بھی اس کے بعد ختم ہو جاتی تھی۔ یا تو وہ نکاح مدت العمر کے لئے ہوتا تھا اور اگر ایسا نہیں تھا تو عورت کو چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایسی مشکلات میں سے گزرنا پڑتا تھا جن کے پیشِ نظر وہ اس مرد کے ساتھ مجبوراً زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے دیتی تھی — مرتی کیا نہ کرتی؟

قرآن آیا اور اس نے اس انسانیت کُش، حیا سوز طریق کو باطل قرار دیا اور کہا ہے کہ ازدواجی تعلق باہمی رفاقت کا ہے اور رفاقت کے لئے ہر قسم کی ہم آہنگی اور یک رنگی ضروری ہے۔ اس رفاقت کا ایک مقصد بقائے نسلِ انسانی بھی ہے۔ لیکن اس سے مقصود صرف بچے پیدا کرنا نہیں، بلکہ بچوں کو ضروری تعلیم و تربیت سے انسان بنانا بھی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب میاں بیوی کے تعلقات رفاقت کے ہوں۔ جب میاں بیوی میں باہمی رفاقت نہ رہے تو رشتۂ ازدواج کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب رشتۂ ازدواج ہی باقی نہیں رہتا تو جنسی اختلاط کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ رشتۂ ازدواج کے اس طرح ختم ہو جانے کے لئے اس نے معاشرتی اغراض کے پیشِ نظر ایک قاعدہ مقرر کر دیا جسے طلاق کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح اس رشتہ کے شروع میں استوار کرنے کے لئے مرد اور عورت کی رضامندی کی ضرورت تھی۔ اسی طرح اسے قائم رکھنے کے لئے بھی دونوں کی رضامندی ضروری ہے جس طرح یہ صورت ہے کہ اگر فریقین میں سے کسی ایک کی رضامندی نہ ہو تو نکاح نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر نکاح کے بعد فریقین میں سے کوئی ایک اسے برقرار رکھنے پر رضامند نہ رہے تو یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس میں جبر کا سوال نہ ابتدا میں تھا نہ بعد میں۔ قرآن کریم نے اس رشتہ کی استواری (یا اس معاہدہ) کے لئے :-

(۱) مردوں کی رضامندی یہ کہہ کر ضروری قرار دے دی کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ - (۴/۳) اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کرو۔ اور

(۲) عورتوں کی رضامندی یہ کہہ کر ضروری قرار دے دی کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ (۴/۱۹) تمہارے لئے یہ قطعاً حلال نہیں کہ تم عورتوں کی مرضی کے بغیر زبردستی ان کے مالک بن جاؤ۔

اس کے بعد اس نے کہہ دیا کہ اس رضامندی کے یہ معنی نہیں کہ جب ایک دفعہ تم نے رضامندی کا اظہار کر دیا تو اس کے بعد تمہارا کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔ یعنی اس کے بعد تمہاری رضامندی رہے یا نہ رہے، تمہیں بہرحال اس رشتے میں جکڑے رہنا ہوگا۔ قطعاً نہیں۔ اس نے کہا کہ یہ رضامندی تو ایک ایک سانس کی رضامندی ہے جب بھی تم میں سے کسی فریق کی رضامندی نہ رہے، یہ معاہدہ کالعدم قرار پا جائے گا۔ اس طرح اس نے مرد اور عورت کو (اس معاہدہ کے سلسلہ میں) برابر کے فریق قرار دے کر شرف و احترامِ انسانیت کی حسین بنیاد رکھ دی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے غلامی کا دروازہ بند کر کے، لونڈیوں کا وجود ختم کر دیا۔

یوں عورت کی رضامندی کے بغیر جنسی اختلاط کا سوال باقی نہ رہا۔

قرآن نے اس رضامندی کو کس قدر اہمیت دی تھی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ ——

ابتدائے اسلام میں جب مکہ کی وہ مسلمان عورتیں جو اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ آگئیں، اس جذبہ کے ماتحت کہ فکر و نظر کی ہم آہنگی ختم ہو جانے کے بعد ازدواجی رشتہ باقی نہیں رہ سکتا، تو خود خدا نے ان کے اس فیصلہ پر صاد کیا۔ اور قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ان کا اُن خاوندوں کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اور اسلامی معاشرہ سے کہہ دیا کہ ان کے خاوندوں نے جو کچھ ان پر خرچ کیا ہے وہ انہیں واپس لوٹا دو۔ اور انہیں اپنے ہاں بصد عزت و احترام رکھو۔

——— (۰) ———

قرآن نے یہ کہا۔ لیکن جب اس کے بعد، مسلمانوں کے عہدِ ملوکیت میں، جنسی ہوسناکی اور بدنہادی کی رسیاں دراز ہونے لگیں تو انہوں نے قرآن کو لپیٹ غلافوں میں، اور پہلے، اپنے حرم میں لونڈیاں لے آئے اور اس کے بعد معاہدہ نکاح کا ایسا حلیہ بگاڑا جس سے (قرآن کی نصِ صریح کے خلاف) عورت کا زبردستی مالک بنے رہنا، عین حلال قرار پا گیا۔ اور کہہ دیا کہ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے جس وقت اس کی رضامندی نہ رہے نکاح کا رشتہ فسخ کر دے لیکن عورت کو اس کا حق حاصل نہیں۔ اسے اس کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔ اور عدالت نے اپنے دروازے پر قسم قسم کی حیلہ جوئیوں کے اتنے اتنے بڑے تالے ڈال دیئے جن کا کھولنا عورت بےچاری کے بس کی بات نہ ہو۔ یوں عورت کو پھر سے اسی مقام پر لا کھڑا کر دیا گیا جس پر وہ قرآن نازل ہونے

سے پہلے تھی۔ یعنی اس کی رضامندی ہو یا نہ ہو، مرد کو اس سے جنسی اختلاط کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ اس سے انکار کرتی ہے تو اس پر قانون کا کوڑا برسا دیا جاتا ہے۔ سوچئے کہ اس قسم کا کوئی قانون، خدا اور رسولؐ کی منشاء کے مطابق ہو سکتا ہے؟

ہمارے یہی قوانین اب تک چلے آ رہے تھے کہ پاکستان میں بعض باحمیت حلقوں کی طرف سے ان کے خلاف آواز بلند ہوئی اور حکومت نے ان میں ترمیم و تنسیخ کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ طلوع اسلام نے اس سلسلہ میں مسلسل کوشش کی کہ یہ قوانین قرآن کی منشاء کے مطابق از سر نو مرتب ہو جائیں جن کی رُو سے، کوئی عورت نہ کسی مرد سے اپنی مرضی کے خلاف نکاح کرنے پر مجبور کی جائے اور نہ ہی وہ اپنی مرضی کے خلاف اس کے نکاح میں رہنے کے لئے مجبور ہو۔ یعنی جس طرح مرد کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے اس معاہدہ کو فسخ کر دے، اسی قسم کا حق عورت کو بھی مل جائے تاکہ اسے اس کی مرضی کے خلاف جنسی اختلاط پر مجبور نہ کر دیا جائے۔ طلوع اسلام نے بڑی جد و جہد کی لیکن قانون وضع کرنے والے حضرات صرف اتنی سی ترمیم پر رضامند ہوتے کہ نکاح نامہ کے فارم میں ایک شق یہ بھی رکھ دی گئی کہ

کیا شوہر نے عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے۔ اور اگر کر دیا ہے تو کن شرائط کے ماتحت۔

یعنی طلاق کا حق تو بدستور مرد کے پاس ہی رہا۔ لیکن اسے اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاہے تو نکاح کے وقت اسے بیوی کو تفویض کر دے۔ چنانچہ اب صورت یہ ہے کہ:۔

(۱) جن نکاح ناموں میں اس سوال کے سامنے لکھ دیا جاتا ہے کہ "بلا مشروط تفویض کر دیا گیا" ان میں عورت کو فسخ نکاح میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ وہ جب جی چاہے اپنے اس حق کا استعمال کر کے معاہدہ نکاح فسخ کر سکتی ہے (اس کے لئے عائلی قوانین میں طریق کار مذکور ہے)۔ لیکن

(۲) جن نکاح ناموں میں ایسا درج نہیں، یا جو نکاح ہی ان قوانین کے نافذ ہونے سے پہلے عمل میں آ چکے تھے، ان میں فسخ نکاح کے لئے عورت کو عدالت میں جانا پڑتا ہے اور وہاں مرد (انتقاماً) ایسا کیچڑ اچھالتے ہیں کہ اس شریف زادی کو اپنا دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض تو تنگ آ کر اپنے دعویٰ ہی سے دستبردار ہو جاتی ہیں۔ اور اکثر صورتیں ہیں، قانونی موشگافیوں کی بنا پر، فیصلہ عورت کے خلاف صادر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد عورت، جنسی اختلاط پر رضامند نہ ہو تو پھر (CONJUGAL RIGHTS) کا ڈنڈا اس کے سر پر ہوتا ہے۔ (ہم تو سمجھتے ہیں کہ جنسی اختلاط کو بطور استحقاق طلب اور حاصل کرنا، بجائے خویش ایسا حیا سوز تصور ہے جسے شرف انسانیت برداشت نہیں کر سکتا۔)

اس پس منظر میں آپ میاں بیوی کے ان جنسی تعلقات کا جائزہ لیجئے جس کی مثال شروع میں دی گئی ہے۔ اس میں عورت اس مرد کے ساتھ جنسی اختلاط کے لئے مجبور کر دی جاتی ہے جس سے اسے سخت نفرت ہوتی ہے۔ (ہم اپنی واجب الاحترام خواتین ـــ ماؤں، بہنوں، بیٹیوں ـــ سے بصد معذرت) عرض کریں گے کہ آپ سوچئے کہ جسے (RAPE) کہتے ہیں، کیا وہ یہی نہیں ہوتا کہ عورت سے اس کی مرضی کے خلاف، جبراً، جنسی اختلاط کا ارتکاب کیا جاتا ہے؟ اس میں اور اس مثال میں فرق اتنا ہی ہے ناں کہ اس میں، اس جبری فعل کو ہمارا مروجہ قانون (RAPE) نہیں کہتا۔ لیکن کیا یہ ضرور ہے کہ جس چیز کو کسی ملک کا مروجہ قانون ناجائز قرار نہ دے وہ عدالتِ خداوندی میں بھی ناجائز قرار نہ پائے؟ اب سوال یہ ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ سو اس کا ذمہ دار معاشرہ کا غلط قانون ہے جو عورت کو جکڑ کر باندھ کر ایسی حالت میں رکھ دیتا ہے جس سے اس کی شرافت بغاوت کرتی ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اس سے معصیت کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔

اے اس معاشرہ میں بسنے والو! خدا کے غضب سے ڈرو!

(۱)

لیکن یہ بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی۔ ہمارے ہاں کتنے گھرانے ایسے ہیں جن میں بیوی خاوند کے ہاتھوں تنگ آچکی ہوتی ہے۔ وہ اس سے نفرت کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی بیوی بن کر رہنے پر مجبور ہوتی ہے؟ کس بات سے مجبور؟ اس بات سے کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے تو کھائے کہاں سے اور جائے کہاں؟ (ہم پھر بصد معذرت عرض کرتے ہیں کہ) معاشرہ میں جو بدنصیب عورتیں جسم فروشی کے لئے مجبور ہو جاتی ہیں، کیا ان کی مجبوریاں اسی قسم کی نہیں ہوتیں؟ کیا وہ بھی اقتصادی احتیاج یا عدم حفاظت کی وجہ سے ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں ہوتیں؟ اگر اس قسم کی مجبوری کے تحت جنسی تعلق ناجائز فعل قرار پاتا ہے تو ایسی ہی مجبوری کے ماتحت، گھر میں رہنے والی عورت کے ساتھ جنسی تعلق کس طرح جائز قرار پا جائے گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس تعلق کو بھی مروجہ قانون، جائز قرار دیتا ہے لیکن کیا انسانیت کی عدالت (جس کے میز پر خدا کی کتاب ہوتی ہے) عورت کے احساسات کے پیشِ نظر ان دونوں میں کچھ بھی فرق کرے گی؟ یہی ہیں وہ انسانوں کے خود وضع کردہ قوانین جنہوں نے ہمیں دنیا میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا، اور ہمارے ساتھ خود اسلام کو بھی رسوا کر دیا۔

یہ تو رہیں بیچاری مجبور و مقہور عورتیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ جو مرد ـــ یہ جانتے ہوئے کہ ان کی بیوی ان کے ساتھ رہنے پر قطعاً رضامند نہیں ـــ انہیں باندھ کر رکھتے ہیں اور اس طرح ان سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں، کیا وہ انسان کہلانے کے مستحق ہیں؟ انسان تو ایک طرف، وہ حیوان کہلانے کے بھی مستحق نہیں ـــ

حیوانات میں جبری جنسی اختلاط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور پھر یہ سوچیے کہ عورت کو اس طرح مجبور رکھ کر جو اولاد پیدا کی جائے گی ۔۔۔ یعنی جو بچے ایسی ماں کی آغوش میں پرورش پائیں گے جو اس قسم کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوگی ۔۔۔ ان بچوں کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوگی؟

شاید آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جو عورتیں معاشی احتیاج یا عدمِ حفاظت کی بنا پر ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں، ان کی مشکل کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ اس کا حل بھی قرآن نے بتایا ہے۔ اس نے سلسلۂ ازدواج کے منقطع کئے جانے کے سلسلہ میں جو احکام دیئے ہیں، ان میں عورت سے کہا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کرتے وقت اس خیال سے مت گھبراؤ کہ میں کھاؤں گی کہاں سے اور جاؤں گی کہاں؟ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (۶۵/۲-۳)، جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرے گا، خدا اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دے گا اور اس مقام سے سامانِ زندگی عطا کرے گا جس کا خیال بھی نہیں کر سکتی ۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ذمہ داریاں جو خدا اپنے اوپر لیتا ہے، انہیں وہ حکومت پورا کرتی ہے جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے۔ یعنی یہ معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ ایسا انتظام کرے کہ یہ عورتیں نہ محتاج رہنے پائیں نہ غیر محفوظ ۔۔۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن، عورتوں کو جبری اختلاط سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا کیا انتظامات تجویز کرتا ہے؟ جو معاشرہ ایسا انتظام نہیں کرتا، اس قسم کے خلافِ انسانیت اعمالِ شنیع کی تمام ذمہ داری اس کے اوپر عائد ہوتی ہے۔ کیا معلوم ان معصوم پابندِ سلاسل خواتین کی خاموش آہیں، اس معاشرہ پر کس قسم کی آگ بن کر برسیں! اور ہمارے ہاں تو یہ آگ بجلی بن کر برس رہی ہے جس سے عائلی زندگی جہنم بن رہی ہے۔

یہ معاشرہ یہ کہہ کر اس جرم کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا کہ اس نے ان جرائم کو قانوناً جائز قرار دے رکھا ہے۔ یاد رکھیے، سنکھیا، سنکھیا ہی رہتا ہے خواہ اسے قانوناً مصری ہی قرار کیوں نہ دے دیا جائے ۔۔۔ سنکھیا اور مصری کے پرکھنے کا معیار، خدا کی کتاب ہے نہ کہ معاشرہ کے مروجہ قوانین۔

——— (۲) ———

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ان حالات میں ہمیں کرنا کیا چاہیئے۔ اس کے لئے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اس وقت قانونی طور پر صورت یہ ہے کہ:

(۱) عائلی قوانین کے مطابق، نکاح نامہ کے فارم میں ایک شق یہ بھی ہوتی ہے کہ

کیا شوہر نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے؟ اگر کر دیا ہے تو کن شرائط کے ماتحت؟

اگر اس شق کا جواب "ہاں" میں لکھ دیا جائے (یعنی بلا مشروط تفویض کر دیا گیا ہے)، تو پھر بیوی کے لئے کسی وجہ سے خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی۔

(۲) لیکن اگر اس شق کے سامنے کچھ نہیں لکھا گیا۔ یا جواب نفی میں لکھا گیا ہے۔ یا نکاح عائلی قوانین کے نافذ ہونے سے پہلے (یعنی ۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء سے پہلے) عمل میں آچکا تھا تو پھر بیوی کو فسخ نکاح کے لئے عدالت میں جانا ہوگا۔ "قانون تنسیخ نکاح" میں بہت سی وجوہات دی ہوئی ہیں جن کی بنا پر عدالت فسخ نکاح کا فیصلہ دے سکتی ہے لیکن اس میں عورت بیچاری کو بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں ۔۔۔ دشواریاں ہی نہیں، مرد کی طرف سے وضع کردہ خرابیاں بھی ۔۔۔ یہی وہ دشواریاں اور خرابیاں ہیں جن کے پیش نظر یہ مظلوم بیچاریاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی ہیں لیکن کچہری میں جانے کی جرأت نہیں کرتیں۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ موجودہ قانون کی جگہ ایک قانون نافذ کر دیا جائے جس کی رُو سے نکاح کا معاہدہ کالعدم کرنے کا جیسا حق خاوند کو ہے ویسا ہی بیوی کو حاصل ہو۔ اس قسم کا قانون نہ صرف بڑا معقول اور مبنی بر عدل و انصاف ہے بلکہ قرآن کریم کے بھی عین مطابق ہے۔ جس معاہدہ کے استوار کرنے میں فریقین مساوی سطح پر ہوں اسے فسخ کرنے میں بھی انہیں مساوی سطح پر ہونا چاہیئے۔ لہٰذا جیسا قانون مرد کے لئے ہو ویسا ہی عورت کے لئے ہونا چاہیئے۔ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جب (عائلی قوانین کی تدوین کے زمانے میں) یہ ترمیم طلوع اسلام کی طرف سے پیش کی گئی تو اس کی کس قدر مخالفت ہوئی تھی ۔۔۔ ظاہر ہے کہ یہ مخالفت مردوں ہی کی طرف سے تھی۔ (اور بدقسمتی سے مُلا بھی سب مرد ہی ہوتے ہیں) مردوں کی حالت عجیب ہے۔ جب ان کے سامنے عورتوں کے حقوق کا ذکر کیجئے۔ تو عورت سے ان کا خیال صرف بیوی کی طرف جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو عورت بیوی کی حیثیت سے مرد کی گرفت میں آچکی ہو، مرد اس کے لئے "حقوق کی تائید" کیسے کرے گا ۔۔۔ بقول اقبالؒ ۔۔۔

دل شاہین نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

عورت سے ان کا دھیان اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی طرف نہیں جاتا۔ مرد عورت پر حکومت کے جذبہ کے نشے میں بدمست ہو کر، کس طرح ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہمارے ہاں اکثریت ان باپوں کی ہے جن کی بیٹیاں، دوسرے گھروں میں، انہی مشکلات میں گرفتار ہیں اور ان کے غم میں خود باپ بھی گھلتا رہتا ہے اور ہزار جتن کرتا ہے کہ اس سے چھٹکارا کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لیکن جب انہی باپوں کے سامنے اس قسم کی معقول تجویز آتی ہے تو ان کے ذہن میں پھر اپنی بیوی آجاتی ہے اور وہ اس کی مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں ۔۔۔ اس کی مخالفت کرتے ہیں اور پھر بیٹیوں کی مصیبتوں کا رونا رونے لگ

جاتے ہیں۔ آپ نے اس سے بڑھ کر بیوقوف قوم بھی کوئی دیکھی ہے؟ عائلی قوانین کے زمانے میں ہمیں اس کا عملی تجربہ ہوا۔ ہماری اس تجویز کی مخالفت ان مردوں کی طرف سے بھی ہو رہی تھی جن کی بہنیں اور بیٹیاں خود اسی مصیبت کا شکار تھیں۔

لیکن اس سے زیادہ موجب حیرت و تاسف یہ حقیقت تھی کہ ہم نے اچھی اچھی پڑھی لکھی خواتین کے سامنے بھی جب یہ تجویز پیش کی تو انہوں نے اس سے اتفاق کیا۔ بلکہ ہمیں بڑے بڑے دلسوز واقعات بھی سناتے جن میں عورتیں اس قسم کی مصیبتیں بھگت رہی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی نے اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔

لیکن اسکے باوجود، ہم مخاطب پھر خواتین ہی کو کرینگے کہ جب تک وہ اس مسئلہ کو لیکر نہیں اٹھینگی، اصلاح کی کوئی تجویز کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس سلسلہ میں کرنے کا کام اتنا ہی ہے کہ مرکزی مجلس قانون ساز (پارلیمان) کے اراکین کو اس پر راضی کیا جائے کہ وہ اس قسم کا قانون پاس کر دیں جس کی رو سے مرد اور عورت دونوں کو فسخ نکاح کا یکساں حق حاصل ہو۔ اور اس قانون کا اطلاق (آئندہ کے علاوہ) موجودہ شادی شدہ عورتوں پر بھی ہو۔ دوسرا کرنے کا کام یہ ہے کہ حکومت سے کہا جائے کہ جو عورتیں اس طرح مخلصی حاصل کرکے 'بے آسرا' ہو جائیں، ان کی ضروریات اور حفاظت کے باعزت انتظام کی صورت پیدا کرے۔

خواتین کی جو انجمن اس سوال کو لے کر اٹھے گی اسے طلوعِ اسلام کی پوری پوری تائید حاصل ہوگی۔ اگر قانون دان حضرات اس سلسلہ میں کوئی بہتر مشورہ دے سکیں تو طلوعِ اسلام کے صفحات اس کے لئے بہ تشکر کھلے ہونگے۔ ہم پھر دہرا دیں کہ اس سوال کا تعلق ہم سب کی بہنوں اور بیٹیوں سے ہے۔ اس لئے، اسے کسی اور کا مسئلہ سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ کیا ہم سینے میں دلِ دردمند رکھنے والے قانون دان حضرات اور ارکانِ پارلیمان سے توقع رکھیں کہ وہ اس باب میں ہمارا ساتھ دینگے؟ جو کچھ کرنا ہے وہ صرف آئینی طور پر کرنا ہے جس میں کسی ہنگامہ خیزی یا غوغا آرائی کی ضرورت نہیں۔ بس ایک قانون میں آئینی تبدیلی کرانی ہے۔

کیسی خوش بختی ہوگی اس ملک کی اگر اس میں اس قسم کا قانون نافذ ہو جائے!

اور جب تک ایسا قانون نہ بن جائے، وہ لڑکیاں جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی اسے نوٹ کر لیں کہ نکاح نامہ میں اس شق کے سامنے، جس میں لکھا ہوتا ہے کہ کیا شوہر نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے، یہ ضرور لکھوائیں کہ — بلا شرط تفویض کر دیا ہے —

جو ہونیوالا خاوند یہ لکھ کر دینے کو تیار نہ ہو اسکے ساتھ نکاح نہ کیا جائے کیونکہ جس کے دل میں ابھی سے چور ہے، وہ آگے چل کر کیا نہیں کرے گا۔

(پیغام)

بابُ المراسلات

قاریوں کے طائفے

سوال :- گذشتہ چند سالوں سے یہ معمول ہو رہا ہے کہ مختلف اسلامی ممالک سے قاریوں کے طائفے آتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں ان کی قرأت کی محفلیں جمتی ہیں۔ وہ گا گا کر قرآن سناتے ہیں اور سامعین مرحبا اور سبحان اللہ کے نعروں سے داد دیتے ہیں۔ وہ چلے جاتے ہیں تو ان کے ریکارڈ، ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اسلام میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کا فائدہ کیا؟

جواب :- اس سوال کے جواب تک آنے سے پہلے تمہیداً کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم پر غور و فکر کر کے، اس پر عمل کرنے والی جماعتِ مومنین نے دنیا میں جو محیّر العقول انقلاب برپا کیا، اور اس سے مفاد پرست گروہوں ––– ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری ––– پر جو زد پڑی، وہ تاریخِ انسانیت کا ایک عدیم النظیر باب ہے۔ ان گروہوں نے محسوس کر لیا کہ عربوں جیسی قوم میں ––– جن کے متعلق ان کی ہمسایہ قومیں یہ کہہ کر اپنی نفرت کا اظہار کیا کرتی تھیں کہ "ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار ––– اس قسم کی حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرنے کی موجب یہ کتاب ہے۔ جب تک اس قوم کو اس کتاب سے بیگانہ نہ کر دیا جائے گا، ان کی مفاد پرستیاں محفوظ نہیں رہ سکیں گی۔ چنانچہ مسلمانوں کو اس کتابِ عظیم ––– زندگی کے اس ضابطۂ خداوندی ––– سے بیگانہ بنانے کے لئے، انہوں نے قسم قسم کی چالیں چلیں اور طرح طرح کی سازشیں کیں۔ کہیں اس کی محفوظیت کے متعلق دلوں میں شکوک پیدا کرنے کے لئے یہ قصہ وضع کیا گیا کہ رسول اللہ اسے ایک مرتب کتاب کی شکل میں دے کر گئے ہی نہیں تھے۔ یہ ہڈیوں، ٹھیکریوں اور کھجور کے پتوں وغیرہ پر لکھا ہوا منتشر پڑا تھا۔ اسے بعد میں مل جل کر کتابی شکل دی گئی اور وہ بھی اس طرح جس میں شکوک و شبہات کے سینکڑوں قرآئن موجود ہیں۔

کہیں کہا گیا کہ شروع میں اس کے حروف پر نقطے ہی نہیں تھے۔ بعد میں لوگوں نے اپنے اپنے قیاس سے ان پر نقطے (اور اعراب) لگائے۔ (نقاط اور اعراب کے فرق سے معانی میں جس قدر فرق پڑ جاتا ہے، عربی دان حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں۔)

کہیں اس کی معنوی حیثیت کے متعلق کہا گیا کہ یہ بڑی مجمل کتاب ہے جس سے کوئی بات متعین طور پر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے بیسیوں قسم کے خارجی سہاروں کی ضرورت ہے۔

کہیں کہا گیا کہ اس میں سینکڑوں آیات ایسی ہیں جنہیں پڑھا تو جاتا ہے لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ دوسری طرف بعض آیات ایسی بھی ہیں جو موجودہ قرآن میں نہیں ہیں لیکن انکا حکم باقی ہے۔

کہیں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآن کے معانی سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے الفاظ دہرا لینے سے ثواب مل جاتا ہے۔ اگر کسی کو اس کے الفاظ بھی پڑھنے نہ آتے ہوں تو وہ اس کی سطروں پر انگلیاں پھیر لیا کرے۔ اس سے بھی تلاوت کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ نماز میں بغیر سمجھے قرآنی سورتوں کا پڑھ لینا۔ تراویح میں قرآن شریف ختم کرنا ـــ جبکہ نہ پڑھنے والا اس کا مطلب سمجھے، نہ سننے والے ـــ مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے قرآن خوانی ـــ سب اسی عقیدہ کے برگ و بار ہیں۔

اس سے آگے بڑھے تو ارباب طریقت نے یہ نظریہ قائم کیا کہ قرآن کا حقیقی مطلب، اس کے الفاظ کے لسانی مفہوم سے سامنے نہیں آسکتا۔ اس کے باطنی معانی ہیں جو ارباب طریقت کے ہاں سینہ بسینہ چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کا مفہوم ان باطنی معانی کی رُو سے سمجھ میں آسکتا ہے ـــ ان باطنی معانی کی ایک جھلک سامنے آجائے تو انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طلسم ہوش ربا کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

اس سے یہ عقیدہ وضع ہوا کہ قرآنی حروف و الفاظ کے ورد، وظیفہ، نقش، تعویذ سے وہ کام لئے جا سکتے ہیں جن کا حصول دنیاوی اسباب و ذرائع سے ممکن نہیں ـــ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ان کا نام "اعمالِ قرآنی" رکھ دیا گیا اور ایسا کرنے والے "عامل" کہلانے لگے۔

اور اگر کسی کے دل میں اس کے الفاظ کے معانی کو پیش نظر رکھ کر پڑھنے کا خیال پیدا ہوا، تو اس سے یہ کہہ دیا گیا کہ قرآن میں غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا جو مطلب سمجھا جا سکتا تھا، وہ سمجھا جا چکا ہے۔ تم اسلاف کے بنائے ہوئے مفہوم سے ذرا بھی اختلاف نہیں کر سکتے۔

یہ (اور اس قسم کے دیگر کئی ایک) حربے تھے جو مسلمانوں جیسی انقلاب آفریں جماعت کو قرآن سے دور اور بیگانہ رکھنے کے لئے وضع اور استعمال کئے گئے۔ نتیجہ اس کا ہمارے سامنے ہے۔ وہی قوم جس نے اسی کتاب کی بدولت، ہر باطل نظام کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا تھا، آج، انہی نظاموں کے علمبرداروں کے دروازوں

پر بھیک مانگتی دکھائی دے رہی ہے!

انہی سازشوں میں ایک سازش یہ بھی تھی کہ قرآن کو گا گا کر پڑھا جائے۔ گانے کا تعلق انسانی جذبات سے ہے۔ آپ کسی اعلیٰ موسیقی کو سنیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس دوران میں نہ گانے والا، عقل و فکر کی رُو سے کسی بات کی طرف دھیان دے سکنے کے قابل ہوگا، نہ سننے والے ۔۔۔ اگر گانے والے کا دھیان ذرا بھی کسی اور طرف چلا جائے تو اس کا راگ بگڑ جاتا ہے۔ اور اگر سننے والے کچھ سوچنے لگ جائیں تو وہ موسیقی کی لذت سے بے کیف ہو جاتے ہیں۔ موسیقی میں سب جذبات ہی گم ہوتے ہیں اور اس دوران میں ان کی عقل و فکر کے (SWITCH OFF) ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مقصد ہی یہ ہے کہ جب انسانی ذہن مسلسل سوچ بچار سے تھک جائے، تو اسے کچھ وقت کے لئے سکون مل جائے۔ لہٰذا کسی چیز کو گا کر پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے متعلق غور و تدبر سے کام نہیں لے سکتا۔ آپ اس کا خود تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ آپ کسی عبارت کو جھوم جھوم کر گا گا کر پڑھیں، آپ دیکھیں گے کہ آپ جذبات سے لذت اندوز تو ہوں گے، لیکن (اس دوران میں) اس کے مطالب و معانی پر غور و فکر نہیں کر سکیں گے۔ اس کے برعکس، آپ اسے نثر کی طرح پڑھیں (یا کسی کو پڑھتے ہوئے سنیں) خواہ آواز سے اور خواہ آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموشی سے ۔۔۔ آپ اس کے مطالب کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں گے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہیں اور ساتھ ہی کچھ گنگنا بھی رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت بھی آپ، جو کچھ گنگنا رہے ہیں، اس کے الفاظ کے معانی و مطالب پر غور نہیں کر رہے ہوتے (بلکہ گنگناہٹ بھی سب سے زیادہ جاذب وہی ہوتی ہے جس میں الفاظ کے بجائے محض سُروں سے کام لیا جاتا ہے)۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ موسیقی میں انسان کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں، اور اتنے وقت کے لئے، غور و تدبر کی صلاحیتیں سو جاتی ہیں۔

دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کی کتاب سے (جیسی کچھ بھی وہ رہ جاتی ہے) اس کے معتقدین کا تعلق جذباتی رہ جاتا ہے۔ وہ ان کے لئے عملی زندگی کا ضابطہ نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی کتابوں "کو عام طور پر گا کر پڑھا جاتا ہے ۔۔۔ مندروں میں دیدوں کے منتر۔ گرودواروں میں گرو بانی کے شبد۔ گرجاؤں میں "خداوندی گیت"۔ صوفیوں میں غزل الغزلات وغیرہ، گا کر پڑھی جاتی ہیں اور اس طرح عقیدت مندوں کے "جذبات کی تسکین" کا سامان بہم پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسی جذباتی تسکین کا نام روحانی اطمینان یا الیشور پرماتما سے لو لگنا رکھ دیا جاتا ہے۔ جب اس کی شدت سے جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں تو اس کا مظاہرہ قوالی کی محفل (سماع) میں، وجد اور رقص کی شکل میں ہوتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ بنانے (اور اس طرح دین کو مذہب

کی سطح پر لے آنے) کے لئے جو سازشیں ہوئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کو گا گا کر پڑھا جائے۔ پھر جس طرح اس قسم کی ہر سازش کو تقدس کا لبادہ اوڑھا دیا گیا، فن قرأت پر بھی تقدس کی چادر چڑھا دی گئی۔

آپ نے اس پر غور کیا ہوگا کہ قرآن کریم نے (فاتحۃ الکتاب کے بعد) سب سے پہلی سورت کے ابتدائی الفاظ میں اپنا تعارف

ذالك الكتاب

کہہ کر کرایا ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ یہ ایک کتاب (ایک ضابطۂ زندگی) ہے اسے کتاب ہی کی حیثیت دینا۔ اس سے الگ کچھ اور نہ بنا دینا۔ اس کے بعد اس میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ یہ واضح عربی زبان کی ایک کتاب ہے جس میں جو کچھ کہا گیا ہے نہایت نکھرے اور ابھرے ہوئے انداز میں کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں، التباس نہیں، کوئی مشکوک بات نہیں۔ کوئی دھندلے ظن و قیاس پر مبنی نہیں۔ پھر اس میں بیان کردہ حقائق پر غور و تفکر کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ کیا ایک اچھی کتاب کی ایسی ہی خصوصیات نہیں ہوتیں؟ (اور یہ تو صرف ایک اچھی کتاب ہی نہیں، بے مثل کتاب ہے)۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ کیا ہم نے اسے کتاب ہی سمجھا ہوا ہے یا کچھ اور بنا رکھا ہے؟ آپ سوچئے کہ:-

(۱) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی کتاب کا ایک لفظ بھی آپ کی سمجھ میں نہ آتا ہو اور اس کے باوجود آپ اسے پڑھتے یا سنتے رہیں؟ آپ کبھی ایسا نہیں کرتے۔

(۲) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی کتاب کے الفاظ (یا جس فن سے وہ متعلق ہے اس کی اصطلاحات) کی رو سے اس کے جو مطالب سامنے آتے ہوں، آپ انہیں مسترد کر دیں اور یہ کہیں کہ ان الفاظ کے کچھ باطنی معانی ہیں اور انہی سے اس کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے؟

(۳) کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ کسی ڈاکٹری کی کتاب میں مندرج نسخوں کو کاغذ پر لکھ کر اور اسے گھول گھول کر مریضوں کو پلائیں۔ یا انجینئری سے متعلقہ کتاب کے فارمولوں کو ٹھیکری پر لکھ کر گرتے ہوئے پلوں کے نیچے دبا دیں کہ اس سے وہ پل مضبوط ہو جائینگے؟

(۴) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ ضابطہ فوجداری کی شقوں کو گا گا کر پڑھیں، اور کمرۂ عدالت میں جج کے سامنے، بھیرویں میں الاپیں کہ

زانی مرد ہو یا عورت، انہیں سو سو کوڑوں کی سزا ملنی چاہیئے۔ (۲۴/۲)

جب آپ کسی اور کتاب کے ساتھ یہ کچھ نہیں کرتے تو قرآن کے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ اس نے خود اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ ـــــ یہ ایک کتاب ہے ـــــ اس تعارف سے اس کا مقصد یہ

کہنا تھا کہ یہ تمہارے لئے زندگی کی راہ نمائی کے لئے کتاب ہے۔ اسے کتاب کی طرح سمجھو۔ اس پر غور و فکر کرو اور پھر اس کے مطابق زندگی بسر کرو۔

آپ سوچئے کہ کیا ہم نے اسے یہی حیثیت دے رکھی ہے؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ،

(۱) جس کثرت، التزام اور اہتمام سے اس کتاب کو پڑھا جاتا ہے،

(۲) جس قدر روپیہ اس کے الفاظ کے دہرانے پر صرف کیا جاتا ہے۔

(۳) جس قدر دولت، وقت، توانائی، اس کی آرائش و زیبائش کے لئے وقف کی جاتی ہے۔

کیا دنیا کی کسی اور کتاب کے متعلق بھی ایسا کیا جاتا ہے؟ اور اس کے بعد اس حقیقت کو بھی سامنے لائیے کہ

اس کتاب کے مفہوم و مقصود سے جس قدر ہم محروم ہیں،

کیا اس کی مثال کہیں اور بھی مل سکتی ہے؟

اور پھر سوچئے کہ جن لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ (اُولٰٓئِكَ) حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۵) — یہ وہ ہیں جن کے اعمال اس قدر بے نتیجہ رہتے ہیں کہ ان کا وزن کرنے کے لئے قیامت میں میزان تک کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ (۱۸/۱۰۴) وہ بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں — کیا ہمارا شمار انہی میں نہیں ہوتا؟

طلوعِ اسلام کی گیارہویں سالانہ کنونشن

اپنی درخشندہ روایات کے مطابق اِمسال

۱۰ر لغایت ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

حسبِ سابق — ۲۵/بی۔ گلبرگ کے سبزہ زار میں — منعقد ہو رہی ہے

اس کے کھلے اجلاس میں تمام اربابِ ذوق شریک ہو سکیں گے۔ اس دفعہ طلبا اور طالبات کے مذاکرہ کا عنوان ہے

"نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر"

تفصیلی پروگرام آئندہ ماہ کے طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے گا۔ — ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

دو اہم سوال

(۱) شادی میں کس کی رضامندی ضروری ہے؟

LOVE MARRIAGES. (۲)

[طلوعِ اسلام کی عام روِش کے مطابق، ان سوالات کو بھی "باب المراسلات" کے تابع آنا چاہیئے تھا لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے انہیں الگ عنوان کے تابع رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ یہ مسائل اربابِ فکر و نظر کی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔]

(۱) **سوال**: آجکل اخبارات میں ایک بحث چل رہی ہے کہ شادی کے لئے، لڑکی اور لڑکے کی رضامندی ہونی چاہیئے یا ان کے ماں باپ کی رضامندی بھی۔ اخبارات میں (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) یہ بحث کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ رہی۔ اس باب میں صحیح صورت کیا ہے؟

جواب: قرآن کریم کی رو سے "نکاح"، عاقل، بالغ لڑکے اور لڑکی کی باہمی رضامندی سے معاہدہ استوار کرنے کا نام ہے۔ لہٰذا لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کے بغیر نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ اب رہی ماں باپ کی رضامندی سو قانونی طور پر یہ لازمی نہیں۔ لیکن ہمارے معاشرہ کی صورت مغربی معاشرہ سے مختلف ہے۔ اس کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ مغرب میں لڑکا اور لڑکی آپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نکاح ہو یا نہ ہو، بالغ ہونے کے بعد اولاد کا ماں باپ سے اور ماں باپ کا اولاد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس لئے وہاں شادی کے لئے، ماں باپ کی رضامندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ہمارے معاشرہ میں، یہ رشتہ لڑکی اور لڑکے کا ہی نہیں ہوتا، بلکہ دو خاندانوں کا رشتہ ہوتا ہے۔ لڑکا، اس لڑکی کا شوہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے خاندان کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ اسی طرح لڑکی بھی شوہر کے خاندان کا ایک فرد بن جاتی ہے۔ اب سوچئے کہ اس لڑکی یا لڑکے نے جس خاندان کا فرد بننا ہے، اس خاندان کو اس باب میں کچھ کہنے کا حق ہونا چاہیئے یا نہیں؟ کسی خاندان کی رضامندی کے بغیر، کسی فرد کو اس کا جزو بنا دینا، جو دوررس نتائج پیدا کر سکتا ہے وہ ظاہر ہیں۔

علاوہ بریں جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے، ہمارے معاشرہ میں، اس کا تعلق اپنے اہل خاندان سے عمر بھر تک رہتا ہے۔ شادی کے بعد جب بھی اس پر کوئی آفت آتی ہے تو اسے (خواہ وہ تین چار بچوں کی ماں بھی کیوں نہ بن چکی ہو) اپنے میکے ہی میں سہارا ملتا ہے۔ کتنے واقعات ہمارے سامنے ہیں جن میں، شادی شدہ لڑکیوں کو، اپنے بچوں سمیت، باقی عمر میکے میں گذارنی پڑتی ہے۔ جب صورت یہ ہے کہ بچی کی مصیبت کا بوجھ اس کے والدین پر (بھی) پڑتا ہے تو کیا والدین کو اتنا اطمینان نہیں کر لینا چاہیئے کہ جس گھر میں لڑکی جا رہی ہے وہاں اس کے لئے مصیبت کا کم از کم امکان ہے؟

اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کہتے ہیں کہ ہم شادی کے بعد آزادانہ زندگی بسر کریں گے، ماں باپ کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں رہے گا، تو اس کے بعد ان کی شادی کے لئے بے شک ان کے ماں باپ کی رضامندی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن اس باب میں کم از کم لڑکی کو یہ حقیقت اپنے سامنے رکھنی چاہیئے کہ ہمارے معاشرہ میں، زندگی میں بیسیوں مقامات ایسے آتے ہیں جہاں عورت کو کسی سہارے یا حفاظت کی ضرورت پڑتی ہے یہ سہارا اور حفاظت بہترین اور باعزت طور پر ماں باپ کے گھر ہی میں مل سکتے ہیں۔ اگر وہ اس گھر سے اپنے تعلقات منقطع کر رہی ہے تو اسے اس کے عواقب کو سامنے ضرور رکھنا چاہیئے۔ بلکہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جس خاوند کو معلوم ہو کہ اس کی بیوی کا اس کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ نہ ہی اس کے لئے کوئی اور حفاظت کا مقام ہے، تو وہ اس کی اس احتیاج کا جس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا کرتا ہے، کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس قسم کے واقعات ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں۔

لہٰذا ہمارے معاشرہ کی لڑکیوں کو، اپنے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے یعنی (۱) جس جگہ اس کی اپنی رضامندی نہ ہو وہاں اسے شادی کرنی ہی نہیں چاہیئے۔ لیکن (۲) اپنی پسند کے ساتھ یہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ اس میں اس کے والدین (یا اہل خاندان) کی پسند بھی شامل ہے۔ یہی طریق بحالات موجودہ، انسب ہے۔ علاوہ بریں شادی کے معاملہ میں انہی کا مشورہ صائب ہو سکتا ہے جنہیں متاہل زندگی کا عملی تجربہ ہو۔ یہ وہ ندی ہے جس میں اترے بغیر تیرنا نہیں سیکھا جا سکتا۔ اس لئے تنہا اپنی رائے یا ان کی رائے کو جنہیں ہنوز شادی کا عملی تجربہ نہ ہو، کافی نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ آرا آپکو غلط راستے پر ڈال سکتی ہیں۔

(۰)

LOVE MARRIAGES.

(۲) سوال:- آج کل ہمارے ہاں (LOVE MARRIAGE) کا بڑا چرچا ہے۔ یہ کیا بلا

ہوتی ہے؟

جواب:۔ یہ "خوبصورت[۱] بلا" ہوتی ہے۔

مغرب کی بے راہ روی نے جنسی ہیجان کو (LOVE) کا نام دے کر عجیب قسم کی خود فریبی (یا فریب دہی) کی طرح ڈال رکھی ہے۔ وہاں یہ لفظ اب کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ دو چار برس اُدھر کا ذکر ہے، انگلینڈ سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں ایک مشہور شخصیت کی حرامکاری کی رنگین داستانیں بڑی تفصیل سے بیان کی گئی تھیں۔ اس کتاب کا نام رکھا گیا تھا (THE GREATEST LOVER OF THE WORLD)۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ وہاں (LOVER) کسے کہتے ہیں۔ اور (LOVE) کیا ہوتی ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ اب ہمارے ہاں بھی عام ہو رہا ہے۔ یہاں بھی کسی کے (LOVE AFFAIRS) سے مراد اسی قسم کے ناجائز تعلقات کی داستانیں ہوتی ہیں۔ آئیے ہم ذرا اس کا تجزیہ کریں۔

ایک نوجوان کسی لڑکی میں کچھ قلبی اور ذہنی (یعنی انسانی) خوبیاں دیکھتا ہے جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔ وہ جوں جوں ان خوبیوں پر غور کرتا ہے، اس کی پسندیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ پاتا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کے رفیقِ زندگی بن سکیں تو سفرِ حیات نہایت خوشگوار ہو جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس نتیجہ تک پہنچنے میں اس کے جذبات کو دخل نہیں ہوگا۔ اس میں اس کی قوتِ فکر (REASONING) کارفرما ہوگی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ اپنی اس پسندیدگی میں (خواہ وہ کتنی ہی شدت تک کیوں نہ پہنچ جائے) کبھی اپنے ہوش و حواس نہیں کھوئے گا۔ وہ کبھی ایسی حرکتیں نہیں کرے گا جن پر دنیا ہنسے۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو کہ وہ اس سے شادی نہ کر سکے تو وہ کبھی پاگل نہیں ہو جائے گا۔ نہ ہی خودکشی کرے گا (ہو سکتا ہے کہ ان خوبیوں کے ساتھ فریقِ ثانی کی جسمانی خوبصورتی بھی وجۂ پسندیدگی ہو لیکن یہ ثانوی چیز ہوگی۔ یہ پسندیدگی ایسی ہی ہوگی جیسے ہم تاج محل یا گلاب کے پھول کو پسند کرتے ہیں)۔

اس کے برعکس، آپ کسی لڑکی کی جسمانی ساخت سے مسحور ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ آپ کی ہو جائے۔ یہ خالص جنسی ہیجان ہے۔ اسے (LOVE) کہہ کر اپنے آپ کو اور معاشرہ کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں آپ کی قوتِ فکر (REASONING) کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یہ کشش خالص جذبات پر مبنی ہوگی۔ اور جوں جوں بڑھتی جائے گی آپ اپنا دماغی توازن کھوتے چلے جائیں گے۔ اگر وہ آپ کو نہیں مل سکتی تو ہو سکتا ہے کہ آپ پاگل ہو جائیں یا خودکشی کر لیں۔ یہی وہ جنسی ہیجان پر مبنی

---

[۱] آغا حشر مرحوم کے ایک ڈراما کا نام تھا۔

"LOVE" ہے جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!

یہ وہ "دماغی خلل" ہے جس کی شدت سے (MATING SEASON) میں بیل اس دروازے کو ٹکریں مار مار کر توڑ دیتا ہے جس کے اندر گائے بندھی ہو۔ اس یکسر حیوانی ہیجان کو مقدس تصور کرنا (LOVE کو بڑا مقدس جذبہ سمجھا جاتا ہے) یا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنا، حیوانیت کو تقدس کا لبادہ اوڑھانا ہے

پوچھا جا سکتا ہے کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ یہ کشش، لڑکی کی خوبیوں کی بنا پر ہے یا اس کا جذبہ محرکہ جنسی ہیجان ہے۔ سو اس کی موٹی سی پہچان یہ ہے کہ اگر آپ کا جی یہ چاہتا ہے کہ اس لڑکی کے جسم سے لمس کیا جائے تو یہ خالص جنسی ہیجان ہے۔ جنسی ہیجان میں جسمانی کشش ہوتی ہے اور شدت سے جسمانی لمس کی خواہش ـــ آپ نے دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں "محبت کے گیتوں" میں "گلے سے لگا لوں" اور "سینے سے لپٹا لوں" کی کس قدر بھرمار ہوتی ہے۔ یہ سب جنسی ہیجان کے مظاہرے ہیں جس کی آخری شکل کو "ہم آغوشی" کی "مہذب" اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [جس جسمانی خوبصورتی میں یہ خواہش پیدا نہ ہو، اس میں جنسی جذبہ کا دخل نہیں ہوتا۔ کسی کی بیٹی یا بہن کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اس کے جسم کے ساتھ جسم لگانے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں آئیگا۔[1]]

اگر اس دماغی خلل (یا جنسی ہیجان) میں لڑکی لڑکا، دونوں مبتلا ہیں تو اس سے اس فریب کا پردہ اور بھی دبیز ہو جاتا ہے گا ـــ آپ دیکھتے ہیں کہ ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال کے افسانوں کو ہمارے ہاں کس قدر "تقدیس" حاصل ہو چکی ہے۔ یہ سب ہمارے "دماغی خلل" کا نتیجہ ہے۔ انہی کا اعادہ اب ہمارے ہاں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں ہو رہا ہے۔ وہ جب اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اسے (LOVE MARRIAGE) قرار دیا جاتا ہے حالانکہ اس (LOVE) کی عمر اتنی ہی ہوتی ہے جتنی جنسی ہیجان کی شدت کی۔ اس کے بعد جب یہ آندھی اتر جاتی ہے تو یہ "فریفتگان" ایک دوسرے میں کوئی ہم آہنگی نہیں پاتے۔ پہلے آپس میں بے رغبتی پیدا ہوتی ہے، پھر ایک دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور یوں اس (LOVE-MARRIAGE) کی ہنڈیا بیچ چوراہے ٹوٹتی ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ (LOVE) کے یہ

---

[1] واضح رہے کہ بچے کو پیار سے چومنا یا گلے لگانا، یا اپنی جوان بیٹی کو شفقت کے ساتھ بازو میں لے لینا، جسمانی لمس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس میں آپ وہ لذت محسوس نہیں کریں گے جو اس لڑکی کے ساتھ جسمانی لمس سے کریں گے، جس سے آپ کو (LOVE) ہے۔

مظاہرے جنسی ہیجان کا نتیجہ تھے' یہ بھی ہے کہ جس شخص میں قوتِ رجولیت نہ ہو (یعنی وہ IMPOTENT ہو) اس میں اس قسم کی (LOVE) کے جذبات کبھی بیدار نہیں ہوتے۔

اس دماغی خلل کی بدترین شکل وہ ہوتی ہے جس میں لڑکا تو پاگل ہو رہا ہو اور لڑکی اس کی طرف مائل نہ ہو۔ بلکہ اس سے گریزاں اور نفرت کرے۔ آپ سوچئے کہ اس صورت میں یہ خواہش اور کوشش کہ وہ لڑکی میری ہو جائے کس قدر بہیمانہ ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اگر یہی کچھ کوئی گنوار اور غیر مہذب نوجوان کرے تو اسے معاشرہ اغوا (یا اغوا کی کوشش) سے تعبیر کرتا ہے۔ اور وہی کچھ "مہذب" نوجوان کرے تو اسے (LOVE) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ (LOVE) یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ لڑکی "بیوی" بننے کے بعد' اس سے اور نفرت کرتی ہے اور کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑانا چاہتی ہے لیکن یہ صاحب اسے زبردستی اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں (I LOVE HER) اس درندہ سے کوئی پوچھے کہ تمہیں اس حیوانی ہیجان کو (LOVE) کہتے ہوئے شرم نہیں آتی!

لیکن اس نوجوان سے کیا کہا جائے۔ محبت کی یہ روش تو ہمارے ہاں "بزرگوں" سے چلی آرہی ہے ہماری (غزل کی) ساری شاعری اسی قسم کی محبت کی مظہر ہے۔ تفصیل میں جانے کے لئے' تو اس پر کتابوں کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اختصار کو لیجئے تو غالبؔ نے اسے ایک مصرعہ میں سمو کر رکھ دیا ہے جب کہا ہے کہ

ہم ہیں مشتاق' اور وہ بیزار

اور اس کے بعد بڑی سادگی سے پوچھتے ہیں کہ

یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے!

حضرت! ماجرا اس کے سوا کیا ہے کہ آپ اس سے زبردستی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے اس زبردستی کو خاموشی سے برداشت کرتی رہتی ہے اور جب آپ کی طرف سے نوبت پیش دستی تک جاتی ہے تو اُدھر سے دھول دھپا شروع ہو جاتا ہے[1] آپ اسے بے وفا کہتے ہیں، ستم کوش کہتے ہیں، جفا پیشہ قرار دیتے ہیں، اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ کس بنیاد پر؟ اس پر کہ جب ہم اس سے محبت کرتے ہیں تو وہ ہم سے محبت کیوں نہیں کرتی۔ آپ نے محبت کی اس منطق کو ملاحظہ فرمایا؟ منطق یہ ہے کہ جس سے ہم محبت کریں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہم سے محبت کرے' خواہ ویسے اسے ہم سے نفرت ہی کیوں نہ ہو۔ اُس کی اس نفرت کا ثبوت خود ان کے اپنے پاس ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ اُسے یہ "رقیبِ روسیاہ"

---

[1] دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا ؎ ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

کہتے ہیں۔ پہلے کوشش کی جاتی ہے کہ ان دونوں میں کسی طرح چشمک ہو جائے۔ اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو رقیب روسیاہ کی موت کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اور جب یہ بھی نہیں ہوتا تو پھر انتہائی بے غیرتی سے اس مفاہمت پر اتر آتے ہیں کہ

تم جانو غیر سے جو تمہیں رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ہماری ساری غزل کی شاعری کی بنیادی (THEME) ہی یہ ہے اس لئے اگر آج کا نوجوان کسی معصوم لڑکی کو زبردستی اپنی گرفت میں لانا، اور لانے کے بعد جبراً اپنے قابو میں رکھنا چاہتا ہے تو وہ اپنے انہی بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ لیکن یہ طرح ہمارے مشرقی شعراء اور اداؤں نے ڈالی ہو یا اب مغرب سے مستعار لی گئی ہو۔ صاف الفاظ میں، جنسی بے راہ روی کے سوا کچھ نہیں ــــ اور جن الفاظ میں اس کا اظہار کیا جاتا ہے وہ اس جنسی ہیجان کا زندہ ثبوت ہوتے ہیں جس "محبوبہ" کی تعریف یہ کہہ کر کی جائے کہ ــــ بہارِ بستر و نوروزِ آغوش ــــ اس سے "محبت" کے دعوے کو جنسی ہیجان نہیں تو اور کیا کہا جائے گا۔ یہ حضرات اس جذبہ کا اظہار شعر میں کرتے تھے۔ ہمارا آج کا نوجوان اس کا اظہار سیٹیاں بجا بجا کر کرتا ہے۔ نام اسکا دونوں ہی (LOVE) رکھتے ہیں۔

یہ سارے تصورات ہماری جنسی بدنہادی کے دور کے پیدا کردہ تھے۔ جنہیں اب مغرب کی ہوسناکیوں نے اور جلا دے دی۔ اور آج اُس بے حیائی کا نام (LOVE) رکھ لیا گیا ہے جس سے انسانیت کی نگاہیں جھک جائیں۔ ہمارا پرانا معاشرہ اس شاعری کی داد دے کر ذہنی لذت حاصل کرتا تھا۔ نوجوانوں نے اسے عملی شکل دے دی۔ ہمارے شعراء کی روحیں، ان سعادت مند نوجوانوں کے لیے "کامیاب عشق"، پر یقیناً داد کے ڈونگرے برساتی ہوں گی کہ شاباش بیٹو۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

یہ ہے ہمارے عزیز! اس (LOVE MARRIAGE) کی حقیقت ــــ جس معاشرہ نے اپنے نوجوانوں کو نہ صحیح تعلیم دی ہو، نہ ان کی صحیح تربیت کی ہو، دوسری طرف ان کے سامنے اسلام وہ پیش کیا جائے جو ہمارے جنسی بدنہادی کے دور کا پیدا کردہ ہے اور جس میں جنسی تعلقات کی ایسی ایسی شکلوں کے لئے جواز کے فتوے دے دیئے جاتے ہیں جن سے حیاء کی نظریں زمین میں گڑ جائیں، اس میں اس قسم کی بے حیائیاں عام نہیں ہونگی تو اور کیا ہوگا۔ اور یہ تو ابھی ابتدا ہے ــــ

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

لیکن اس ضمن میں ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر کوئی "حرمزدگی" کرنا چاہتا ہے تو اسے (کم از کم) "حرمزدگی" سمجھے اور کہے۔ اسے (LOVE) کا "مقدس نقاب" تو نہ اوڑھائے۔ لیکن اگر ان کے مقدس بزرگ جبری اختلاط[1] کو شرعی جواز کی سند عطا کر دیں، اور ان کے شعراء اسے محبت کہہ کر پکاریں، تو یہ اسے (LOVE) سے کیوں نہ تعبیر کریں!

ایں خانہ ہمہ آفتاب است!

یاد رکھیئے! (MARRIAGE) کہلانے کا مستحق صرف وہی رشتہ ہے جس کی بنیاد قلبی اور ذہنی خصوصیات و تصورات کی ہم آہنگی ہو۔ اگر یہ بنیاد ابتداء ہی میں نہیں، تو وہ (MARRIAGE) نہیں۔ اور اگر (MARRIAGE) کے بعد وہ رشتہ باقی نہیں رہا تو اس کے بعد، وہ (MARRIAGE) بھی باقی نہیں رہتی۔

---

[1] اس سلسلہ میں جنسی اختلاط سے متعلق وہ مقالہ ملاحظہ فرمائیے جو اسی اشاعت میں کسی دوسرے مقام پر شائع ہو رہا ہے۔

پیشگی خریدار متوجہ ہوں

ادارہ طلوع اسلام سے جب کوئی نئی کتاب یا کسی کتاب کا نیا ایڈیشن شائع ہوتا ہے تو اس کے متعلق طلوع اسلام میں یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ پیشگی خریداروں میں سے جو حضرات یہ کتاب نہ لینا چاہتے ہوں وہ ایک خاص تاریخ تک ادارہ کو مطلع کر دیں جس کے بعد کتاب کی روانگی شروع کر دی جائیگی۔

جن خریداروں کی طرف سے نفی میں جواب آجاتا ہے انہیں کتاب نہیں بھیجی جاتی۔ باقی خریداروں کو کتاب بھیج دی جاتی ہے۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ان خریداروں میں سے (جو کوئی جواب نہیں بھیجتے) بعض یہ کہہ کر کتاب واپس کر دیتے ہیں کہ انہیں کتاب مطلوب نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے ادارہ کو خواہ مخواہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر انہیں وہ کتاب مطلوب نہ تھی تو طلوع اسلام کو پہلے مطلع کر دیا جاتا۔

پیشگی خریداران حضرات سے ہم ایک بار پھر گزارش کرینگے کہ

جب کبھی طلوع اسلام میں کسی کتاب کے متعلق اس قسم کا اعلان شائع ہو اور آپ کو وہ کتاب مطلوب نہ ہو، تو آپ براہ کرم ادارہ کو اس سے مطلع فرما دیا کریں۔ آپ کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے پر آپ کو کتاب بھیج دی جائے گی اور اس کے بعد آپ کی شکایت بے جا ہو گی۔

ناظم

علامہ تمنا عمادی مدظلہ العالی

ہماری تاریخ

علامہ ابن جریر طبری

(۲)

آدم پر سرِ مقصد یہاں تک جو کچھ میں نے لکھا اُس سے مقصود صرف یہ تھا کہ ناظرین اور ان کے ذریعے دوسرے لوگ خصوصاً ابن جریر کو اپنا امام ماننے والے حضرات ابن جریر کو پوری طرح جان لیں اور پہچان لیں۔ اس کے بعد میں اصل موضوع بحث پر آتا ہوں۔

میرا ایک دعوےٰ تو یہ تھا کہ ابن جریر طبری مفسر و مؤرخ شیعہ تھے۔ اس کو میں قطعی دلائل سے ثابت کر چکا۔ اور منکرین کے بے دلیل انکار کا بے دلیل ہونا بھی ثابت کر چکا۔ اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ منکرین کے دلائل کی تردید میں اپنے مفصل مقالے میں کر چکا ہوں جو ہفتہ وار طلوع اسلام کے تین پرچوں میں بہ اقساط ثلاثہ شائع ہو چکا ہے۔ دو ابن جریر تھے۔ اور عبداللہ المامقانی کے نزدیک تین ابن جریر تھے۔ ہر ایک کا نام محمد، ہر ایک کی کنیت ابوجعفر، ہر ایک کے باپ کا نام جریر، ہر ایک طبرستان کے شہر آمل کا رہنے والا تھا اور تینوں ایک ہی زمانے میں ایک ہی ملک میں تھے، غالباً شکل و صورت بھی تینوں کی ایک ہی تھی اور تینوں بڑے عالم و ادیب تھے۔ دو ابن جریر کہنے والوں نے مفسر و مؤرخ ابن جریر کے دادا کا نام یزید بتا کر لکھا کہ اس میں کچھ ذرا سا تشیع تھا اور دوسرے کے دادا کا نام رستم تھا، وہ پکا شیعہ تھا۔ سنی شیعہ دونوں فرقوں کے محدثین جو ابن جریر کی وفات کے کئی سو برسوں بعد پیدا ہوئے تھے یہ کہنے لگے تھے حالانکہ ایک ہی شخص تھا جس کا سابق مجوسی نام رستم تھا۔ مسلمان ہوا تو اسلامی نام یزید رکھا گیا۔ مگر بعد کو چودھویں صدی کے شیعہ محدث ایرانی نے تین ابن جریر قرار دے دیئے۔ میں نے اس کی پوری بحث بھی اپنے اسی مقالے میں کی ہے۔ اس وقت اُس بحث کو دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس وقت میرا دوسرا سب سے اہم دعویٰ یہ ہے کہ ابن جریر جو اپنی تاریخ میں کتب الیٰ السری عن شعیب عن سیف بن عمر لکھتے ہیں یہ قطعاً جھوٹ ہے کسی سری نے ان کے پاس سیف کی من گھڑت باتیں شعیب کے واسطے سے روایت کر کے لکھ لکھ کر نہیں بھیجی تھیں۔ میں نے دو ہی سری کا ذکر کیا تھا۔ چونکہ ابن جریر نے کہیں کہیں سری بن یحییٰ بھی لکھا تھا، اور تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب تقریب، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال، میزان الاعتدال، لسان المیزان، تعجیل المنفعہ، انساب سمعانی اور تاریخ صغیر کسی میں بھی سری بن یحییٰ التمیمی الکوفی کا دو لفظی ترجمہ بھی نہ تھا۔ ابن یحییٰ کی قید کے ساتھ سری بن یحییٰ البصری ہی کا ذکر تہذیب التہذیب خلاصہ وغیرہ میں ہے۔ دوسری ولدیتوں کے ساتھ سری بن مسکین اور سری بن نعیم میں سے کسی کو کوئی تعلق شعیب بن ابراہیم یا سیف بن عمر سے نہ تھا۔ صرف سری بن اسماعیل الکوفی ہی تھے جو سیف بن عمر سے روایتی تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے میں نے لکھا کہ سری بن یحییٰ کہیئے تو وہ بصری تھے اور ایک محدث تھے۔ ان کو تاریخ و سیرت سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، صرف سری کہیئے تو سری بن اسماعیل ہی سیف بن عمر سے روایت بھی کرتے تھے اس لئے سیف بن عمر کی روایتیں لکھ لکھ کر اگر کوئی سری بھیجتا تو یہی بھیجتے۔ مگر یہ دونوں سری ابن جریر کی پیدائش سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔

اب جب سری بن یحییٰ التمیمی کا نام سامنے آگیا ہے تو مناسب یہ ہے کہ پہلے ان کے خاندان سے ناظرین کو واقف کرا دوں۔ سری بن یحییٰ التمیمی الدارمی الکوفی کا شجرہ نسب پہلے ملاحظہ فرمایئے۔

سری بن مصعب بن ابی بکر بن شبر بن صعفوق بن عمرو بن زرارہ بن عدس
بن زائدہ بن عبداللہ بن دارم التمیمی

ابوالسری ہناد بن السری بن مصعب
ہناد اکبر۔ متوفی ۲۴۳ھ

یحییٰ بن السری بن مصعب

ابوعبیدہ سری بن یحییٰ التمیمی

ابودارم محمد بن السری بن ابی عبیدہ سری بن یحییٰ۔
یہ اپنے والد سے اپنے تشیع کے باعث الگ رہے اور
اپنے چچیرے دادا ہناد اکبر سے روایت کرتے تھے مگر جوانمرگ مرے۔

ابوالسری ہناد بن ابی عبیدہ سری بن یحییٰ ہناد اصغر
یہ اپنے باپ کے ہم مسلک تھے۔ اپنے چچیرے دادا ہناد اکبر
سے روایت نہیں کرتے تھے۔ متوفی ۳۳۲ھ

ابوبکر احمد بن محمد بن ابی عبیدہ سری بن یحییٰ متوفی ۳۵۸ھ۔ انکو باپ شیر خوار چھوڑ کر وفات پا گئے۔
دادا اور پھر چچا کی گودوں میں پلے تو پھر نہایت غالی شیعہ ہو کر مرے۔

یہ تو ابو عبیدہ سری بن یحییٰ التمیمی الکوفی کا مختصر سا خاندانی شجرہ ہوا۔ یہ ابو عبیدہ اپنے کاروبار تجارت میں برابر مصروف رہے مگر اپنے چچا ہناد اکبر سے مذہبی اختلاف کی وجہ سے ان کے دیکھا دیکھی کبھی کبھی کوئی شیعوں سے سن سن کر کچھ روایت بھی بعض عوام کے سامنے کیا کرتے تھے۔ مگر ان کے بیٹے ہناد اصغر کے سوا کسی نے کبھی ان کی روایتوں کی طرف دھیان نہ دیا، اس لئے یہ گمنام ہی رہے اور چونکہ جو حدیثیں یہ روایت کرتے تھے وہ شیعوں ہی سے سن کر، اس لئے اہل سنت کی نظروں سے بالکل گرے رہے۔ ان کو باہر کے لوگ جانتے بھی تھے تو ان کے چچا ہناد کی وجہ سے۔ کتابوں میں بھی ان کا ذکر کہیں آگیا ہے تو "ابن اخی ہناد" کے لفظ کے ساتھ یعنی "ہناد کے بھتیجے"۔ ائمہ رجال میں سے کسی نے بھی ان کا ترجمہ اپنی کتاب میں نہیں لکھا۔ ان کا ذکر ضمناً آگیا ہے۔ ان کے شیعہ بیٹے یا ان کے سنی بیٹے یا ان کے شیعہ پوتے کے ذکر میں ان کا نام ضرور مذکور ہو گیا ہے مگر خود ان کا ترجمہ مطلق کسی کتاب میں مذکور نہیں۔ چونکہ یہ بھی تمیمی تھے اور ابن ابی حاتم رازی بھی تمیمی تھے، دونوں کے درمیان کچھ قرابت بھی ہو تو عجب کیا ہے۔ جب ابن ابی حاتم کتاب الجرح والتعدیل لکھنے لگے تو محدثین کوفہ کا حال بھی لکھنا ضروری تھا۔ ابو عبیدہ سری بن یحییٰ کے چچا ہناد بن سری مشہور محدث تھے ان کے حالات بھی ان کو لکھنا تھے۔ ابو عبیدہ کو جو خبر ملی تو ان کے منہ میں بھی پانی بھر آیا کہ کاش کسی طرح میرا ذکر بھی اس کتاب میں آجاتا تو انہوں نے کچھ حدیثیں اہل سنت کی ادھر اُدھر سے لے کر اپنی روایت سے ابن ابی حاتم کے پاس بھیجدیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر بلا طلب محض تحفتہً یا رشوۃً جو حدیثیں بھیجی ہونگی منتخب اور صحیح حدیثیں ہی بھیجی ہوں گی یا ممکن ہے کہ اپنے چچا ہناد بن سری ہی کی حدیثوں میں سے کچھ حدیثیں بھیج دی ہوں اپنے نام سے، ابن ابی حاتم نے اس تحفے کا شکریہ اس طرح ادا کر دیا کہ ان کا نام اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں درج کر لیا اس لئے بھی کہ انہوں نے اپنا تعارف ضرور کرایا ہوگا۔ ہناد بن السری کا ذکر کر کے کہ میں اُن کا بھتیجا ہوں مگر نہ ان حدیثوں کو انھوں نے اپنی کتاب میں درج کیا نہ ان حدیثوں کی وہ وجادۃً اپنے تلامذہ سے روایت کرنے لگے۔ ابن ابی حاتم خود لکھتے ہیں کہ مجھ کو ان سے بگوش خود کچھ سننے کا موقع نہ ملا۔ یعنی دونوں میں لقا بھی نہ تھی۔ صرف ہناد بن السری کے بھتیجے ہونے کے باعث اور جو حدیثیں بھیجی تھیں وہ بھی سچی ہی نظر آرہی تھیں۔ اس لئے اتنا لکھ کر کہ ان سے کچھ سننے کا موقع تو نہیں ملا مگر انہوں نے خود میرے پاس کچھ اپنی حدیثیں بھیج دی تھیں اس لئے صدوقٌ یعنی سچے ہیں۔ کوئی اس کو مدح سمجھے تو سمجھے میں تو اس کو قدح ہی سمجھتا ہوں۔ یہ تعدیل نہیں ہے بلکہ جرح ہے کیا کوئی مثال ایسی پیش کی جا سکتی ہے کہ بلا طلب کسی نے کسی ایسے شخص کے پاس اپنی حدیثیں بھیج دی ہوں جس سے ملاقات تک نہ ہو؟ اگر پہلے کی ملاقات ہوتی تو یقیناً ابن ابی حاتم اس کا ذکر کرتے۔ ابن ابی حاتم نے یہ لکھ کر کہ انہوں نے اپنی کچھ حدیثیں

میرے پاس بھیج دی تھیں۔ اُن سے کچھ سننے کا اتفاق مجھ کو نہیں ہوا۔ یہ ظاہر کر دیا کہ یہ شہرت طلب تھے، محدثین کے حالات پر مشتمل کتاب لکھی جا رہی ہے یہ سن کر انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ کسی طرح ان کا نام بھی کتاب میں جمع ہو جاتے۔ جو حدیثیں بھیجی تھیں وہ ان کے نزدیک سچی تھیں اس لئے ان کے لئے آخر میں صدوقؒ لکھ دیا۔ بس صرف ایک ابن حاتم کے صدوقؒ لکھ دینے سے وہ بھی بغیر سماع ولقا کے سری بن یحییٰ تمیمی الکوفی ثقہؒ وثبتؒ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ لکھ کر کہ ان سے کچھ سننے کا اتفاق نہیں ہوا ابن ابی حاتم نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ صدوقؒ بھی محض رعایتی ہے۔

غرض ابن ابی حاتم کا اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں ان کا اس حقیر طرح سے ذکر نہ ان کے لئے باعثِ فخر ہے نہ اس کو پیش کرنے والے اس ذکر سے ان کی کوئی امتیازی حیثیت ثابت کر سکتے ہیں۔ باقی رہا تاریخ بغداد میں خطیب بغدادی نے جو ان کا ذکر عطاردی کی ثقاہت کی شہادت میں پیش کیا ہے وہ ایک ضمنی ذکر ہے۔ احمد بن عبدالجبار العطاردی الکوفی ایک مجروح راوی تھے۔ اُن پر محدثین میں عمر کا الزام تھا کہ یہ ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہیں جن سے ان کی لقار وسماع ثابت نہیں ہے بلکہ متقدمین سے بلا واسطہ روایت کرتے ہیں جن کو انہوں نے عقل وشعور کی عمر میں دیکھا بھی نہیں۔ اس الزام کی تردید میں ایک شہادت تو ابو کریب محمد بن العلاء الکوفی الہمدانی کی پیش کی ہے کہ ابو بکر بن عیاش سے عطاردی نے حدیثیں سُنی ہیں۔ ابو کریب الکوفی ایک مشہور محدث ہیں۔ بخاری ومسلم وغیرہ ساری کتب حدیث میں اُن سے روایتیں ہیں، مگر صرف ایک وہ بھی فقط سماع کی شہادت کافی نہ تھی۔ ثقاہت وعدالت کی بھی شہادت کی ضرورت تھی تو اور کسی مشہور محدث کی شہادت تو نہ مل سکی مگر ایک مشہور محدث ہناد بن السری کے بھتیجے یعنی سری بن یحییٰ ابو عبیدہ ہی کی شہادت پیش کر دی کہ یہ عطاردی کے ہم طبقہ، ہم سن، ہم وطن بھی تھے اور دونوں میں تعلقات یارانہ بھی تھے۔ ابو کریب کو تو سب جانتے ہیں کہ وہ ایک مشہور محدث ہیں مگر ابو عبیدہ سری بن یحییٰ کو تو جو بھی جانتا ہے اسی قدر جانتا ہے کہ یہ ہناد بن سری کے بھتیجے ہیں۔ خود کیا ہیں؟ خود تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ پھر ان کی شہادت کی کیا اہمیت ہوگی۔ اسی لئے ان کے بارے میں بھی خطیب نے لکھ دیا ہے کہ ابو کریب ہی بڑے محدث نہیں ہیں۔ شیخ جلیل ثقہؒ یہ بھی ایک بزرگ شیخ اور ثقہ ہیں، تاکہ ان کی شہادت عطاردی کے حق میں مفید سمجھی جائے تو ان کی شہادت سے عطاردی ثقہ ثابت کئے گئے اور عطاردی کے حق میں شہادت دینے کی بدولت یہ ابو عبیدہ سری بن یحییٰ شیخ جلیل ثقہؒ بن گئے۔ اگر دو سو برس کے بعد یعنی خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ کر تھے اور یہ ابو عبیدہ سری بن یحییٰ بقول خطیب عطاردی کے ہم طبقہ تھے۔ عطاردی کی سماعت کی شہادت ابو کریب نے دی ہے کہ ابو بکر بن عیاش

سے عطاردی نے حدیثیں سنی ہیں۔ ابوکریب متوفی ۲۴۸ھ اور ابوبکر بن عیاش متوفی ۱۹۳ھ خود عطاردی متولد ۱۷۷ھ ومتوفی ۲۷۲ھ۔ ابوعبیدہ سری بن یحییٰ عطاردی سے کچھ بڑے یا کچھ چھوٹے تھے یا ہم سن تھے۔ ۲۵۰ھ سے ۲۶۰ھ تک کے درمیان ان کی وفات کا تخمینہ[1] ہے۔ غور کیجئے، ابوعبیدہ سری بن یحییٰ کو خطیب سے پہلے کسی نے رعایۃً صرف ثقہ بلکہ لا باس بہ بھی نہیں کہا۔ جو ایک ہلکی سی جرح ہے کسی نے ان کو منہ تک نہیں لگایا، اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ محدثین کے زمرے میں ان کا ذکر کیا جائے۔ ان کے بعد سو برس تک کسی نے ابن ابی حاتم کے سوا کبھی ان کا نام تک نہ لیا۔ دو سو برس کے بعد عطاردی کے ثقہ کے کہہ دینے کی بدولت خطیب کی زبان قلم سے شیخ جلیل ثقہ بن گئے ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

رفتن بپائمردی ہمسایہ در بہشت!

یہ تو ابوعبیدہ سری بن یحییٰ التمیمی الکوفی کا تعارف[2] ہوا۔ تو اب اصل بحث یہ ہے کہ ابن جریر جو اپنی تاریخ میں کتب الی السری لکھتے رہے وہ سری یہ ابوعبیدہ سری بن یحییٰ التمیمی ہی ہیں۔ یا یہ بھی نہیں ہو سکتے؟

ابن جریر ۲۵۳ھ میں مصر پہنچے تھے۔ وہاں کئی برس رہے وہاں کے محدثین سے ملے۔ ان سے حدیثیں حاصل کیں۔ جو محدثین ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے ان کے تلامذہ سے ملے اور ان سے

---

[1] معترض صاحب نے سری بن یحییٰ الکوفی کا سال وفات تقریباً ۲۵۸ھ بلا دلیل لکھا ہے۔ جب وہ عطاردی کے ہم طبقہ تھے تو ان سے دونوں کی پیدائش کا سال ایک یا کچھ آگے یا کچھ پیچھے ہو سکتا ہے۔ وفات ممکن ہے کہ دس برس پہلے ہو یا بعد۔ سری بن یحییٰ کے تین ہی شیوخ ابن ابی حاتم نے لکھے ہیں تینوں کی وفات ۲۲۰ھ سے پہلے ہے۔ ان کے تلامذہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس سے تو قرینہ اس کا معلوم ہوتا ہے کہ ۲۴۰ھ کے اندر ہی وفات پا گئے ورنہ ۲۲۰ھ کے بعد وفات پانے والے ان کے کچھ شیوخ اور ضرور ہوتے۔ اگر ابن ابی حاتم یہ نہ لکھتے کہ انہوں نے کچھ حدیثیں اپنی میرے پاس بھیجی تھیں تو میں ان کا سال وفات ۲۳۰ھ ہی قرار دیتا۔ ابن ابی حاتم متولد ۲۴۰ھ متوفی ۳۲۷ھ کے پاس غالباً ۲۶۰ھ، ۲۷۰ھ میں سری بن یحییٰ نے اپنی کچھ حدیثیں بھیجی ہوں گی اور ۲۶۰ھ کے بعد ۲۷۰ھ سے پہلے سری بن یحییٰ کی وفات بعد ۲۵۸ھ کا تو کوئی قرینہ ہی نہیں ہے۔ ۱۲

(طلوع اسلام) علامہ صاحب کا جو مختصر مقالہ طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا، اس پر کسی صاحب نے تنقید کی تھی جو ہفت روزہ الاعتصام میں شائع ہوئی تھی۔ اس مقالہ میں "معترض" سے مراد وہی صاحب ہیں۔

[2] اس تعارف سے ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ ابن ابی حاتم کے سوا اسماء الرجال نے ان کو مرفوع القلم کیوں سمجھا؟ اور میرا ذہن ان کی طرف کیوں نہ گیا۔ ۱۲

حدیثیں لیں۔ ابراہیم بن اسمٰعیل المزنی متوفی سنہ ۲۶۴ھ سے ملے۔ ان سے کتاب الشافعی پڑھی۔ پھر پوری کتاب کی نقل حاصل کی۔ کیا اس میں تین چار برس نہیں صرف ہوئے ہوں گے؟ اس بنا پر بگمان غالب ابن جریر مصر سے کوفہ سنہ ۲۵۶ھ میں یا اس سے کچھ قبل یا بعد پہنچے ہوں گے۔ مصر کے بعد کوفے پہنچے تھے۔ اس کی دلیل یاقوت حموی کے بیان سے ہیں لکھ چکا کہ مصر سے ابن جریر کتاب الشافعی کی نقل کوفے لائے تھے۔ اور اس کتاب کو عراق یعنی کوفے میں انہوں نے کچھ محدثین کے سامنے پڑھا تھا۔

یعقوب بن ابراہیم الدورقی کی وفات سنہ ۲۵۲ھ میں ہوئی تھی۔ وہ بغدادی تھے۔ ابن جریر اگر رے سے چل کر پہلے بغداد پہنچے ہیں تو ممکن ہے کہ ان سے ملے ہوں اور ان سے ان کی مُسند کی نقل لی ہے۔ ورنہ اگر کوفے سے فارغ ہو کر وہ بغداد پہنچے اور بغداد سے اپنے وطن طبرستان سنہ ۲۹۰ھ میں واپس گئے تھے تو یعقوب بن ابراہیم الدورقی سے ان کی ملاقات کا کوئی امکان نہیں انہوں نے دورقی کی مُسند کی صرف نقل حاصل کر لی تھی اور اس مسند سے حدیثیں نقل کر کے حدثنا یعقوب بن ابراھیم اپنی کتابوں میں لکھتے رہے۔ ان کی مسند ان کو ان کے کسی شاگرد سے مل گئی ہوگی۔

توکوفے میں جب سنہ ۲۵۶ھ میں یا اس کے کچھ قبل یا کچھ بعد ابن جریر پہنچے تھے تو عطاردی متوفی سنہ ۲۷۲ھ سے اور سری بن یحییٰ تقریباً متوفی سنہ ۲۵۸ھ سے ضرور ملاقات کر سکے ہوں گے۔ دو برس کا وقت کافی وقت ہے مگر صرف عطاردی اور سری بن یحییٰ التمیمی ہی سے تو ان کی ہوس پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ وہاں کے بہت سے محدثین سے ان کو ملنا تھا اور جو محدثین ان کی تشریف آوری سے پہلے وفات پا چکے تھے ان کے تلامذہ سے مل مل کر ان لوگوں سے حدیثیں لینی تھیں۔

غرض بعض حدیثیں یا بعض تاریخی روایتیں جو ابن جریر حدثنا کر کے عطاردی سے یا سری بن یحییٰ التمیمی سے تفسیر یا اپنی تاریخ میں روایت کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح ہوں۔ عطاردی تو بُرے یا بھلے ایک محدث تھے بھی، سری بن یحییٰ کا تو نہ محدثین میں شمار تھا نہ مؤرخین میں۔ مگر محدثین کے ماحول میں ضرور رہے تھے۔ اپنے چچا ہناد بن سری سے مذہبی اختلاف تھا مگر قرابت کے تعلقات تو قائم تھے۔ اس لئے محدثین کی صحبت میں برابر حدیثیں سُنا کرتے تھے۔ جو یاد رہ جاتی تھیں ان کو روایت بھی کرتے تھے۔ مگر ان کی روایت پر کسی کو اعتماد نہ تھا۔ اس لئے ان کے ایک بیٹے ہناد اصغر کے سوا جو ان کا ہم مسلک تھا کسی نے بھی ان سے سنی ہوئی حدیث ان کی وساطت سے کہیں روایت نہیں کی۔ ابن جریر بڑے ذہین و ذکی اور مردم شناس تھے۔ انہوں نے سری بن یحییٰ کی کس مپرسی کا اندازہ بھی ضرور کر لیا ہوگا اور جس وقت ابن جریر کوفے پہنچے تھے اس وقت سری بن یحییٰ ابو عبیدہ کی عمر نوے برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ تو روایت کے بھی کام کے

اس وقت زندہ رہے ہوں گے۔ اگر واقعی اس وقت تک زندہ ہوں گے، یعنی سری بن یحییٰ ابو عبیدہ خود تو ایک مجہول الحال شخص ہیں۔ عطاردی کے طفیل میں ان کا ذکر خطیب نے کر دیا اور اُن کو عطاردی کا ہم طبقہ لکھ دیا۔ تو بس صرف اس "ہم طبقہ" کے لفظ سے ان کو عطاردی کا ہم سن سمجھ لیا گیا۔ جس سے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ عطاردی کی ولادت ۱۷۰ھ میں ہوئی تھی تو ان کی ولادت بھی عطاردی کے کچھ قبل یا کچھ بعد ہوئی ہوگی یا شاید دونوں ایک سن کے پیدا ہوں۔ مگر دونوں کی وفات بھی اسی طرح ۲۰۰ھ ہی میں یا کچھ قبل یا کچھ بعد ہوئی ہو' یہ تو ہم طبقہ ہونے کے لئے ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ عطاردی سے دس بارہ برس پہلے ہی سری بن یحییٰ کی وفات ہو گئی ہو اور ابن جریر یہ سری بن یحییٰ کی وفات کے بعد کوفے پہنچے ہوں۔ اس کا امکان کہ عطاردی کی وفات سے کم و بیش قبل سری بن یحییٰ کی وفات ہوئی زیادہ ہے۔ بخلاف اس کے کہ سری بن یحییٰ عطاردی کی وفات کے آٹھ دس برس بعد مرے ہوں۔ اس لئے کہ عطاردی نے تو ۹۰ برس کی عمر پاکر وفات پائی تھی۔ اور سری بن یحییٰ عطاردی کے تقریباً ہم عمر تھے تو اب ۹۵ برس کے بعد آٹھ دس برس اور زندہ رہے ہوں' اس کی بہت کم امید ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی طویل العمری ایک ذریعہ اس کا ہو جاتی کہ ان کا سال وفات لوگ لکھ دیتے ... یا کم سے کم اتنا لکھتے کہ یہ سو برس سے زیادہ عمر پاکر مرے جیسا کہ اکثر طویل العمر راویوں کے بارے میں ائمہ رجال لکھ دیتے ہیں۔

غرض دو ہی باتوں کا امکان ہے کہ یا تو سری بن یحییٰ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے جس کا ترجیہ زیادہ ہے۔ دوسری ممکن بات یہ ہے کہ جس وقت ابن جریر کوفہ پہنچے تھے، سری بن یحییٰ اس وقت زندہ تو ہوں مگر نوے برس سے زیادہ عمر کے شیخ فانی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ۹۰۔۹۵ بلکہ کسی سو برس سے زیادہ عمر کے محدث سے کچھ حدیثیں کچھ روایتیں کوئی سن لے۔ اس لئے جو روایتیں تاریخ یا تفسیر میں ابن جریر نے سری بن یحییٰ التمیمی سے مروی لکھی ہیں ممکن ہے کہ اُن سے سنی ہوں۔ وہ حدیثیں اور وہ روایتیں درحقیقت صحیح ہوں یا غلط، مگر اس کا امکان ضرور ہے کہ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے کے وقت سری بن یحییٰ زندہ ہوں اور ابن جریر نے ان سے کچھ حدیثیں سنی ہوں اور شاید کچھ تاریخی خبریں بھی۔ مجھ کو اس سے انکار پر اصرار نہیں ہے اور نہ یہ میرا موضوع بحث ہے۔ میں نے یہ کہاں لکھا ہے کہ کسی سے ابن جریر روایت نہیں کر سکتے۔

میرا دعویٰ تو اسی قدر ہے کہ ابن جریر جو کتب الیٰ السری لکھتے ہیں غلط لکھتے ہیں، جھوٹ لکھتے ہیں۔ ابن جریر جب کوفہ پہنچے تھے اس وقت سری بن یحییٰ زندہ بھی تھے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر زندہ بھی تھے تو جب وہ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے کے وقت یعنی ۲۷۰ھ کے لگ بھگ نوے برس سے

کچھ زیادہ ہی عمر کے تھے تو جب ابن جریر ۲۹۰ھ میں طبرستان واپس پہنچے تھے کیا اس بیس برس کی مدت کے درمیان بھی سری بن یحییٰ التمیمی زندہ ہی تھے؟ اگر زندہ رہ گئے تھے تو ۲۹۰ھ میں جس وقت ابن جریر طبرستان واپس جا رہے تھے، سری بن یحییٰ ایک سو دس برس کے ہو چکے ہوں گے۔ کیا ایک سو دس برس کے شیخ فانی سے یہ توقع کوئی صاحب عقل کر سکتا ہے کہ وہ شعیب بن ابراہیم الکوفی سے لے لے کر سیف بن عمر کتاب زندیق کی من گھڑت تاریخی روایتیں کوفے سے لکھ لکھ کر کئی برس تک ابن جریر کے پاس طبرستان بھیجتا رہے؟

سری بن یحییٰ اور شعیب و سیف

"روایت" بھی مقولہ اضافت سے ہے۔ اہل علم اس علمی اصطلاح سے واقف ہیں۔ روایت کا تعلق تین شخصوں سے ہوتا ہے۔ ایک راوی ہے، دوسرا مروی لہٗ ہے یعنی راوی جس کے سامنے روایت کر رہا ہے، تیسرا مروی عنہ ہے یعنی راوی جس سے روایت کر رہا ہے۔ ابن جریر کا دعویٰ ہے کہ سری بن یحییٰ التمیمی الکوفی راوی بالکتابت تھے یعنی روایتیں لکھ لکھ کر ان کے پاس کوفے سے طبرستان بھیجا کرتے تھے۔ ابن جریر ان کے مروی لہٗ تھے کہ وہ ان کے پاس لکھ لکھ کر بھیجتے تھے اور شعیب بن ابراہیم الکوفی التمیمی مروی عنہ تھے کہ سری بن یحییٰ التمیمی شعیب بن ابراہیم ہی سے سیف کی گھڑی ہوئی تاریخی کہانیاں لکھ لکھ کر ابن جریر کے پاس بھیجتے تھے۔ یا شعیب سے جو کچھ انہوں نے کسی زمانے میں سنا تھا اس کو لکھ لکھ کر بھیج رہے تھے تو مروی لہٗ ہونے کا دعوےٰ ابن جریر کو ہے۔ اور سری بن یحییٰ راوی کا وجود بھی ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل سے اور تاریخ بغداد سے ثابت ہو رہا ہے۔ مگر غور کیجئے کہ ابن ابی حاتم کیا یہ لکھتے ہیں کہ جس طرح شعیب بن ابراہیم الکوفی کو ائمہ رجال نے سیف بن عمر کا راوی اخبار و حدیث اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ اسی طرح شعیب کے راوی اخبار سری بن یحییٰ التمیمی تھے؟ انہوں نے سری بن یحییٰ التمیمی کا شاگرد یا راوی اخبار ابن جریر کو لکھا؟ ابن ابی حاتم متولد ۲۴۰ھ متوفی ۳۲۷ھ اور ابو حاتم اور ابن ابی حاتم الرازی یہ دونوں باپ بیٹے مائل بہ تشیع بھی تھے۔ ابن ابی حاتم نے مشہور شیعہ محدث وقاری فضل بن شاذان سے خاص طور سے قرآن مجید پڑھا تھا جس کا ذکر ابن حجر نے ان کے ترجمے میں کیا ہے دیکھئے تہذیب التہذیب ولسان المیزان۔ مگر یہ لوگ جھوٹی حدیثیں خود گھڑنے والے اور جھوٹی حدیثیں قصداً روایت کرنے والے نہ تھے۔ اس لئے ابن جریر کے تعلقات ان دونوں باپ بیٹے سے نہ رہتے باوجود اس کے کہ ابن جریر برسوں ان کے وطن رہنے میں ان کے پڑوس میں رہے۔ غرض ابن ابی حاتم ابن جریر سے ناواقف ہوں ممکن نہیں۔ وہ ابن جریر سے ۱۹ برس چھوٹے تھے۔ جب ابن جریر رے میں محمد بن حمید الرازی وغیرہ کی صحبت میں تھے

اسی زمانے میں یہ پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریر کی وفات سے ۱۷ برس بعد وفات پائی اس لئے ابن جریر کی تفسیر وتاریخ ضرور دیکھی ہوگی۔ ابن جریر کے شاگردوں سے خصوصاً احمد بن کامل سے ان کے تعلقات ضرور ہوں گے۔ ابن جریر کے کتب الی السری لکھنے کی ان کو ضرور خبر مل گئی ہوگی۔ اگر وہ یہ سمجھتے یا ابن جریر کے تلامذہ میں سے کسی سے بھی سن لیتے کہ یہ سری وہی سری بن یحییٰ التمیمی الکوفی ہیں جن کا ذکر ہم نے اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں کیا ہے تو وہ ضرور اپنی کتاب میں اس کا ذکر کر دیتے۔

تعجب اور سخت تعجب تو خطیب بغدادی متولد ۳۹۲ھ ومتوفی ۴۶۳ھ پر ہے کہ انہوں نے سری بن یحییٰ کو جو دو سو برس کے بعد شیخ جلیل ثقہ کی سرٹیفکیٹ عطا فرمائی، اس کے ثبوت میں وکان من تلامذتہ ابن جریر الطبری بھی کیوں نہ لکھ دیا؟ اس سے تو علما رد کے حق میں ان کی گواہی اور بھی معتبر تر ہو جاتی۔ اس لئے ابن جریر کا ان کا مروی لہ ہونا فقط ابن جریر ہی کی تحریر سے دعویٰ بلا دلیل بلا گواہ ہے۔ خود مدعی خود گواہ۔ اپنے دعوے کی دلیل خود اپنا بیان!

سب سے تعجب تو یہ ہے کہ نہ ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں ان کو شعیب بن ابراہیم کا راوی یا تلمیذ لکھا اور نہ خطیب نے لکھا۔ خطیب کے کتب خانے میں تو ابن جریر کی تفسیر وتاریخ دونوں ہی ہوں گی اور یقیناً خطیب نے دونوں کتابوں کی خوب سیر کی ہوگی۔ سری بن یحییٰ التمیمی کا ذکر تو کرتا مگر نہ ان کے شاگرد رشید بلکہ اکلوتے بیٹے ابن جریر کا ان کے نام کے ساتھ ذکر کرنا، نہ ان کے اتنے بڑے شیخ التاریخ شعیب بن ابراہیم کا ان کے ساتھ ذکر کرنا، چہ معنی دارد؟

ابن ابی حاتم نے فقط ان کا ذکر کر کے چھوڑ دیا ہوتا تو سمجھا جاتا کہ مقصود فقط انہیں کا ذکر تھا۔ اس لئے ان کے شیوخ وتلامذہ کا ذکر چھوڑ دیا۔ ابن ابی حاتم نے ان کے شیوخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ روی عن قبیصۃ و ابی غسان وعثمان بن زفر۔ قبیصہ بن عقبہ السوائی الکوفی متوفی ۲۱۳ھ یا ۲۱۵ھ۔ ابو غسان الہندی مالک بن اسماعیل الکوفی متوفی ۲۱۹ھ یہ شیعہ تھے۔ اور عثمان بن زفر بن مزاحم التیمی الکوفی متوفی ۲۱۸ھ سے روایت کرتے تھے۔ مگر شعیب بن ابراہیم کا نام نہیں لکھا حالانکہ وہ بھی کوفی ہی تھے۔ اور ابن ابی حاتم کے ہم قبیلہ تیمی تھے۔ اگر سری بن یحییٰ تنہا کوفے میں شعیب بن ابراہیم کے شاگرد تھے اور جو کچھ تاریخی ذخیرہ سیف بن عمر کا تھا صرف شعیب بن ابراہیم ہی کے پاس جمع تھا اوروں کے پاس کچھ تھا تو وہ بہت کم تھا۔ مگر شعیب کا سارا ذخیرہ شعیب سے تنہا سری بن یحییٰ التمیمی ہی نے حاصل کر لیا تھا۔ اور وہ سب لکھ لکھ کر اور کچھ روایت رُود رَد کر کے ابن جریر طبری کو سری بن یحییٰ نے دے دیا تھا تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ سری بن یحییٰ کے ترجمے میں ابن ابی حاتم نے نہ شعیب بن ابراہیم کا کچھ ذکر کیا نہ

ابن جریر کا نہ خطیب نے سری بن یحییٰ کو جو شیخ "جلیل" "ثقہ" لکھا تو اس کے ثبوت میں ان کے شیخ شعیب بن ابراہیم کا ذکر کیا نہ ان کے اکلوتے شاگرد رشید ابن جریر کا ذکر کیا۔ فقط سری بن یحییٰ التمیمی کا نام تو کسی کتاب میں دکھا دینا کافی نہیں۔ یہ ثابت کرو کہ شعیب بن ابراہیم کے یہ شاگرد اور ابن جریر کے یہ استاد تھے۔

حقیقت الامر درحقیقت ابن ابی حاتم اور خطیب دونوں ہی خوب جانتے تھے کہ ابن جریر کو کسی سری نے بھی ایک حرف بھی لکھ کر کبھی نہیں بھیجا۔ سری بن یحییٰ کو کوئی تعلق روایت حدیث یا اخبار کا شعیب بن ابراہیم یا سیف بن عمر سے کبھی نہیں رہا۔ ابن جریر کے کوفے سے نکلنے سے پہلے سری بن یحییٰ التمیمی وفات پا چکے تھے۔ صرف ابن جریر کا بھرم رکھنے کے لئے غالباً ابن ابی حاتم نے سری بن یحییٰ التمیمی کا سال وفات نہیں لکھا حالانکہ یقیناً ابن ابی حاتم کی وفات سے تقریباً بیالیس برس پہلے سری بن یحییٰ التمیمی کی وفات ہو چکی ہو گی جس طرح عبید بن سباق راوی حدیث جمع قرآن کا سال وفات ائمہ رجال نے امام بخاری، ترمذی و نسائی کا بھرم رکھنے کے لئے چھپا دیا۔ باوجود اس کے کہ خود امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں لکھا تھا۔ مگر میرے رسالہ جمع قرآن کی اشاعت کے بعد میرا اعتراض روایت جمع قرآن پر دیکھ لینے کے بعد جب تاریخ کبیر شائع کی گئی تو عبید بن سباق کا ذکر جو اس میں ہے اس میں سے سال وفات حذف کر کے چھاپا۔ اپنی طرف سے ۱۱۵ھ سے قبل کا کوئی سنہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ چونکہ تذکرۃ الحفاظ میں شائع ہو چکا ہے کہ ۱۱۵ھ میں جو عبید بن سباق زندہ تھے تو اس سے پہلے ان کی وفات کیسے قرار دیتے۔

الملخص جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ سری بن یحییٰ التمیمی الکوفی کا روایاتی تعلق شعیب بن ابراہیم سے تھا اس وقت تک ابن جریر کا کتب الی السری لکھنا کبھی صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ابن جریر کا سری سے، سری کا شعیب سے تعلق "دو" میں سے ایک بات کا ذکر بھی نہ ابن ابی حاتم کرتے ہیں نہ خطیب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابن حجر اور حافظ ذہبی بھی شعیب بن ابراہیم کو صرف سیف بن عمر کا راوی اخبار تو لکھتے ہیں مگر شعیب کا راوی سری بن یحییٰ کو نہیں لکھتے۔ ابن جریر کے دعوے کے ثبوت میں خود ابن جریر کے اسی دعوے کو پیش کرنا مصادرہ علی المطلوب کی بدترین مثال ہے جو اہل علم کے لئے ننگ کی بات ہے۔

(باقی آئندہ)

قرآنی دعوتِ فکر کے عہد آفریں شاہکار

۱۔ لغات القرآن یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اسکی تعلیم کیا ہے، اسکی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے، یہ اسکا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے، مکمل سیٹ، پچاس روپے میں۔

۲۔ اسلام کیا ہے؟ یہ مسئلے مسائل کی کتاب نہیں، یہ آپ کو بتائیگی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رُو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ قیمت (قسم اعلیٰ) آٹھ روپے۔ (چیپ ایڈیشن) چار روپے۔

۳۔ سلیم کے نام سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملاّ کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اسکے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت حصہ اول۔ آٹھ روپے، حصہ دوم و سوم چھ چھ روپے۔

۴۔ نظامِ ربوبیت نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

۵۔ خدا اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصرِ معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ قیمت (قسم اعلیٰ مجلد) نو روپے، (قسم دوم) پانچ روپے۔

۶۔ سلسبیل قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں۔ یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں ـــــ قیمت۔ آٹھ روپے۔

۷۔ بہارِ نو یہ مقالات کے مجموعہ کا دوسرا حصہ ہے جس سے ذہن میں جلا پیدا ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں ـــ سستا ایڈیشن۔ قیمت پانچ روپے۔

۸۔ اسبابِ زوالِ امت ملاّ کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اس لئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت دو

۹۔ اسلامی معاشرت
اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کو صحیح اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ اندازِ بیان سلیس اور دلچسپ۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت دو روپے

۱۰۔ قرآنی فیصلے
زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اول ۳/۲۵، جلد دوم ۳/۲۵، جلد سوم ۳/۰ روپے

۱۱۔ قرآنی قوانین
ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ وکلاء حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوتی ہے۔ قیمت ۲/۰ روپے

۱۲۔ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں
تمام مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی۔ وہ کیسے مرتب ہوئیں۔ کن کن مراحل سے گزریں اور آج ان کی حالت کیا ہے۔ قیمت ۲/۰ روپے

۱۳۔ جہاد
اسلام کے اہم ترین اور اس کے ساتھ ہی نازک ترین موضوع پر مختصر لیکن جامع کتاب۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جوابات۔ قیمت دو روپے۔

۱۴۔ پاکستان کا معمارِ اول
ہماری نئی نسل سرسید کے عظمتِ مقام سے ناواقف ہے۔ اس کی سیرت و کردار اور مسلمانوں کے لئے اس کی خدمات کا تعارف نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ (قیمت ۲/۰ روپے)

۱۵۔ عربی خود سیکھئے
قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے اس لئے ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جاتے ہیں کہ قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ قیمت ۴/۵۰ روپے

۱۶۔ مقامِ حدیث
وہ کتاب جس نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں؟ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے۔ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے۔ علمِ حدیث کے متعلق اس ایک کتاب کے اندر اس قدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت ۸/۰ روپے

۱۷۔ الفتنۃ الکبریٰ
مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مؤرخ طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہدِ حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (قیمت ۔ چھ روپے)

یہ کتابیں اور پرویز صاحب کی دیگر تمام تصانیف کے ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

احادیث کا صحیح ترین مجموعہ

جس کے ایک لفظ میں بھی کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا

پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ ۱۰، ۱۱، ۱۲ نومبر ۱۹۶۷ء
کے کھلے اجلاس سے خطاب فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احادیث کا صحیح ترین مجموعہ

جس کے ایک لفظ میں بھی کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا

صدرِ گرامی قدر و عزیزانِ محترم۔ سلامٌ مسنون۔

اصطلاح میں حدیث، حضور نبی اکرمؐ کے اقوال اور اعمال کو کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر حضورؐ کے سامنے کوئی بات ہوئی اور اس سے آپ نے منع نہیں فرمایا۔ اس کی تردید کی، تو وہ بھی حدیث کے زمرہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اسے اصطلاح میں تقریر کہتے ہیں۔ آپ نے قرآن کریم کو تو مرتب اور مدوّن شکل میں امت کو دیا لیکن اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر نہیں دیا۔ کافی عرصہ بعد، بعض حضرات نے اپنے طور پر اُن احادیث کو جمع کرنا شروع کیا جو اُس وقت لوگوں میں زبان زد تھیں۔ احادیث کے اس قسم کے بہت سے مجموعے ہیں لیکن ان میں سے چھ مجموعے ایسے ہیں جنہیں سُنّی حضرات صحیح مانتے ہیں۔ (شیعہ حضرات کے اس قسم کے اپنے مجموعے ہیں)۔ سُنّیوں کے ان مجموعوں میں، امام بخاریؒ اور مسلمؒ کے مجموعے صحیح ترین تسلیم کئے جاتے ہیں، اور بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ ان جامعین احادیث کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے۔

(۱) امام بخاریؒ　یہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ اور قریب ۲۵۶ھ میں سمرقند میں وفات پائی۔

(۲) امام مسلمؒ　یہ ایران کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

(۳) امام ابو عیسیٰؒ ترمذی　یہ ایران کے شہر ترمذ میں پیدا ہوئے۔ سالِ وفات ۲۷۹ھ ہے۔

(۴) امام ابوداؤدؒ — یہ سیستان (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ۲۷۵ھ میں وفات پائی۔
(۵) ابن ماجہؒ — یہ شمالی ایران کے شہر قزوین کے رہنے والے تھے۔ سن رحلت ۲۷۳ھ ہے۔
(۶) امام نسائیؒ — یہ مشرقی ایران کے صوبہ خراسان کے ایک گاؤں نساء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سنِ وفات ۳۰۳ھ ہے۔

یہ تمام حضرات ایرانی تھے اور انہوں نے اپنے مجموعوں کو، لوگوں کی زبانی روایت سے، تیسری صدی ہجری میں مرتب فرمایا۔ ان مجموعوں کے اتنا عرصہ بعد اور اس طرح مرتب کئے جانے کا نتیجہ ہے کہ (اور تو اور خود) سُنّی حضرات بھی ان مجموعوں کی تمام احادیث کو صحیح نہیں تسلیم کرتے۔ کوئی ایک حدیث کو صحیح قرار دیتا ہے تو دوسرا اس سے انکار کرتا ہے۔ چنانچہ امت میں اس وقت جس قدر اختلافات پائے جاتے ہیں، انکی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ان اختلافات کی نوعیت کیا ہے، اس کے لئے ہم ان بحثوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جو ہزار برس سے امت میں متواتر چلی آرہی ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں خود اپنے زمانے کے دو مکاتبِ فکر کا ذکر کر دینا کافی سمجھتے ہیں، جو حدیث کے بہت بڑے حامی ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب، (صدر جمعیت اہلحدیث) اپنے رسالہ "جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث" میں تحریر فرماتے ہیں:

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا ہے ..... جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں انکا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مترادف۔ (صفحہ ۴۸)

آگے چل کر وہ رقمطراز ہیں:-

> بخاری اور مسلم کی احادیث پر امت متفق ہے ..... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (صفحہ ۵۱)

اس سے ظاہر ہے کہ اہل حدیث حضرات کے عقیدہ کے مطابق، بخاری اور مسلم کی کسی حدیث سے انکار، کفر ہے اور ایسا کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ

> یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر۔ ۱۹۵۲ء)

اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسول مان لینا ضروری ہے۔ جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں مانتے۔ (رسائل و مسائل حصہ اول۔ صفحہ ۲۹۱)

خود حنفی حضرات، بخاری اور مسلم کی قریب دو سو احادیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اہل حدیث حضرات، ان مجموعوں کی کسی ایک حدیث کے انکار کو بھی کفر قرار دیتے ہیں اور ایسا سمجھنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ جب بخاری اور مسلم کا (جو حدیث کے صحیح ترین مجموعے سمجھے جاتے ہیں) یہ حال ہے تو باقی مجموعوں میں اختلافات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ان مجموعوں کی تعداد پچاس کے قریب بتائی ہے اور وہ ان سب میں صحیح اور غیر صحیح کا اختلاط مانتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود، اقوال و اعمال رسول اللہؐ کا ایک مجموعہ ایسا بھی ہے جس کے کسی ایک لفظ میں بھی کسی مسلمان کو ۔۔۔ خواہ وہ سنی ہو یا شیعہ ۔ حنفی ہو یا اہلحدیث۔ مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ ہوں یا مودودی صاحب ۔۔۔ کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس مجموعہ میں اس قسم کے اقوال بڑی تعداد میں ہیں ۔۔ وہ میرے پاس موجود ہے۔ میں آج کی نشست میں، اس میں سے کچھ اقوال پیش خدمت کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس خطاب کے خاتمہ پر میں، اس اہم مجموعہ کی زیارت بھی آپ حضرات کو کرا دوں گا۔ قلت وقت کے پیش نظر میں ان اقوال کا صرف اردو ترجمہ اور مفہوم پیش خدمت کروں گا۔ متن بعد میں آپ حضرات خود دیکھ لیجئے گا۔ وَ اللّٰہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔

خدا کا تصوّر

دین کی بنیاد ایمان خداوندی پر ہے۔ لیکن خدا پر ایمان کے یہ معنی نہیں کہ خدا کے متعلق جس قسم کا جی چاہے تصور قائم کر لیا جائے اور اسے خدا پر ایمان قرار دے دیا جائے۔ خدا پر ایمان کے معنی

ہیں خدا کا صحیح تصور۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان اقوام و افراد کو بھی خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جو خدا کے منکر نہیں، اُسے مانتے ہیں۔ ان لوگوں کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دینے سے مفہوم یہ ہے کہ وہ خدا کا صحیح تصور اپنے سامنے رکھیں۔ اس اعتبار سے میں سب سے پہلے خدا کے اس تصور کو پیش کرتا ہوں جسے رسول اللہ ؐ نے بیان فرمایا۔ اس سلسلہ میں پہلے کائناتی خدا کو سامنے لایا گیا اور کہا کہ

(۱) کیا تم اس خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو مراحل میں پیدا کیا۔ تم غیر خدائی قوتوں کو اس کا ہمسر قرار دیتے ہو حالانکہ وہ خدا جملہ کائنات کا نشو و نما دینے والا ہے۔ (۴۱/۹)۔

(۲) ذرا مجھے بتاؤ کہ اگر خدا زمین کی گردش کو ساکت کر دے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تمہارے ہاں ہمیشہ رات ہی رہے، دن نہ چڑھے۔ یا (دوسری طرف) دن ہی رہے، رات پڑے ہی نہیں۔ تو وہ کون ہے جو زمین کے اس سکون کو مبدل بہ حرکت کر کے سلسلۂ لیل و نہار کو جاری کر سکے۔ یہ اس کی رحمت ہے جو اس نے اسی سلسلہ کو یوں قائم کیا ہے کہ تمہارے لئے کام اور آرام کے وقفے باری باری آتے رہتے ہیں۔ (۲۸/۷۱-۷۳)۔

(۳) پھر فرمایا کہ تم مجھے بتاؤ کہ خدا کے سوا وہ کون ہے جو تمہیں بحر و بر کے تاریک راستوں کے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ (۲۷/۶۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب خدا ہی کا ہے (اور اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے)۔ (۲۷/۶۴)۔

(۴) فرمایا کہ، مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے جو تمہیں زمین و آسمان سے رزق دیتا ہے۔ (اسبابِ رزق کس کے پیدا اور مہیا کردہ ہیں؟) وہ کون ہے جو تمہاری سماعت و بصارت پر پورا پورا اقتدار رکھتا ہے؟ وہ کون ہے کہ جس کا قانونِ تخلیق، بے جان مادہ سے زندگی کی نمود کرتا، اور زندہ اجسام کے عناصر کو ہر آن تحلیل کر کے ان کی جگہ جدید سالمات وجود میں لاتا ہے۔ وہ کون ہے جو اس عظیم سلسلۂ کائنات میں تدبیر امور کرتا ہے۔ یہ ہے تمہارا رب (جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں) لیکن تمہاری یہ کیفیت ہے کہ تم ایسی کھلی ہوئی حقیقت کے بعد جس کا تمہیں خود اعتراف ہے، غلط راستوں پر چل نکلتے ہو۔ اس خدا نے کائنات کی تخلیق کی ابتدا کی تھی اور اب وہ اسے مختلف گردشیں دے کر سنوارتا چلا جاتا ہے؟ کیا اس تمام نظم و نسق میں کسی اور کا قانون شریک و سہیم ہے؟ (ایسا ہو ہی نہیں سکتا)۔ (۱۰/۳۱-۳۴)

(۵) (اے خدا پر ایمان رکھنے کے مدعیو! انہیں یہ تو تسلیم ہے کہ) زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے، وہی کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے کو نشو و نما دیتا ہے۔ اور اس کا مرکزی

کنٹرول بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہر شے کا محافظ ہے لیکن اسے کسی کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ (اتنا کچھ تم مانتے ہو۔ لیکن اس کے بعد یہ کیوں نہیں مانتے کہ جس طرح کائنات کی ہر شے اس کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے تمہیں بھی ان قوانین کی اطاعت کرنی چاہیئے) مجھے حیرت ہے کہ اس مقام پر آکر تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ وہ کونسی بات ہے جس سے تم اس معاملہ میں دھوکا کھا جاتے ہو۔ (۲۳/۸۴ — ۸۹)

(۶) ذرا سوچو کہ اگر کائنات پر خدا کا نظامِ نشو و نما محیط نہ ہوتا ـــــ وہ نظام جو ہر شے کو سامانِ پرورش بھی بہم پہنچاتا ہے اور اس کی حفاظت کا انتظام بھی کرتا ہے ـــــ تو زندگی کے خطرات سے تمہیں کون بچا سکتا تھا۔ (۴۲/۲۱)۔ یاد رکھو! اس کے سوا تمہارا کوئی حامی و ناصر نہیں۔ (۳۱/۲۹)۔ وہی تمہیں سامانِ زیست عطا کرتا ہے۔ (۳۴/۲۴)۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ (۳۴/۲۷)۔

انسان کی اپنی دنیا

(۷) خارجی کائنات کے بعد، تم خود اپنی طرف آؤ، اور مجھے بتاؤ کہ اگر خدا تمہاری سماعت و بصارت اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کرلے تو وہ کون ہے جو تمہیں یہ قوتیں اور صلاحیتیں واپس دلا دے یا اس تباہی سے تمہیں محفوظ کر دے (جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہے۔ (۶/۴۶ — ۴۷)

(۸) یاد رکھو! خدا مالک الملک ہے۔ خدائی اور کبریائی کے اقتدارات صرف اسی کو حاصل ہیں۔ قوموں کی حکومت و سطوت۔ عروج و زوال۔ عزت و ذلت کے فیصلے سب اس کے متعین فرمودہ قوانینِ مشیت کے مطابق ہوتے ہیں۔ (۳/۲۵)۔ وہ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے۔ وہ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَة ہے۔ تمام اختلافی امور میں قولِ فیصل اسی کا قانون ہے۔ (۳۹/۴۶)۔ تم کسی بات کو اپنے دل میں چھپاؤ یا اس کا اظہار کرو، اسے سب کا علم ہوتا ہے۔ (۳/۲۹ ؛ ۲۲/۶۸ — ۶۹) رزق کی بستگی و کشادگی بھی اسی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ جو ان قوانین کا اتباع کرتا ہے اسے رزق کی کشادگی حاصل ہو جاتی ہے۔ جو ان کے خلاف چلتا ہے، اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ (۳۴/۳۴ ؛ ۲۰/۱۲ — ۴)۔ یاد رکھو! کائنات کا ہر حادثہ اسی کے قوانین کے مطابق رونما ہوتا ہے۔ اور انسانی زندگی میں رنج و راحت بھی اسی کے قوانین کے مطابق حاصل ہوتے ہیں، (۹/۱۵) ؛ (۴/۷۸)۔

(۹) اسے بھی اچھی طرح سن رکھو کہ جغرافیائی حدود سے نہ اس کی خدائی میں فرق آ سکتا ہے۔ نہ ہی یہ چیز انسانوں میں تفریق کا باعث بن سکتی ہے۔ اسلئے کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کے ہیں (۲/۱۴۲)

(۱۰) میں پھر دہرا دوں کہ جس خدا پر ہم ایمان رکھتے ہیں وہ وہ ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے کو سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے۔ وہ ہر شے کا خالق ہے۔ نفع اور نقصان سب اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق پہنچتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس، تم انہیں خدا مان رہے ہو جن میں اس کی کوئی قوت نہیں۔ سوچو کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں۔ کیا تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہو سکتی ہے؟ (۱۳/۱۶)۔ ایسی چیزوں کو معبود بنا لینا جنہیں نہ کسی قسم کا اختیار و اقتدار حاصل ہو۔ نہ ہی وہ کسی عقل و فکر کی مالک ہوں۔ اگر حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ (۳۹/۴۳ ـــ ۴۴)

(۱۱) (تم اچھی طرح سن رکھو کہ) میرا رب وہ ہے جس کے علاوہ کوئی اس قابل نہیں کہ اس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ (۱۳/۳۰)۔ تم اس کے ساتھ جنہیں شریکِ خدائی کرتے ہو ذرا انہیں بلاؤ تو سہی۔ ذرا ان کا کچھ پتہ نشان تو دو۔ باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم ان کے ذریعے خدا تک اپنی بات پہنچاتے ہو، تو وہ بیچارے خود کسی بات کا علم نہیں رکھتے۔ وہ تمہاری بات اس خدا تک کیا پہنچائیں گے جو ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ (۱۳/۳۰ ـــ ۳۳) (۱/۵۲) و (۲۰/۹۳)۔ اگر اس کے کوئی شریکِ خدائی ہوتے تو وہ یقیناً اس کے تختِ کبریائی تک جا پہنچتے (لیکن ایسا ہو ہی نہیں سکتا)۔ (۱۷/۴۲)۔ یاد رکھو! ان میں سے کوئی ہستی ایسی نہیں جو تمہیں نفع یا نقصان پہنچانے کا اقتدار رکھتی ہو۔ (۳۹/۳۸)۔ یا اگر تم پر خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی سے کوئی مصیبت آ جائے تو وہ اس مصیبت سے تمہیں بچا لے۔ (۱۷/۵۶)۔ اور اگر تم کہو کہ یہ ہستیاں غیب کا علم رکھتی ہیں تو اس بات کو کان کھول کر سن لو کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ (۲۷/۶۵)۔

(۱۲) (میں نے خدا کے متعلق یہ چند باتیں تم سے بیان کی ہیں ورنہ) اس کی صفات و کلمات کا تو یہ عالم ہے کہ اگر دنیا کے سمندر روشنائی بن جائیں، تو وہ پھر بھی ختم نہ ہوں۔ (۱۸/۱۰۹)۔ تفصیل سے جاننے سے تو اس کی یہ کیفیت ہے لیکن اگر اسے اجمالاً سمجھنا چاہو تو یہ سمجھ لو کہ جس خدا کی طرف میں دعوت دیتا ہوں، وہ خدائے واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ وہ یگانہ ہے اسے کسی کی احتیاج نہیں لیکن کائنات کی ہر شے اپنی ہر احتیاج میں اس کی دستِ نگر ہے۔ وہ نہ تو سلسلۂ تولید سے وجود میں آیا ہے، نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے۔ دو لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ اس کا کوئی مثیل و نظیر و ہمسر نہیں۔ وہ اپنی ذات و صفات میں یگانہ و لاشریک ہے۔ (۱۱۲/۱ ـــ ۴)۔

(۱۳) میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم ایسے خدا کی بابت جھگڑے نکالنا چاہتے ہو جو اسے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں، سب کو سامانِ زیست مہیا کرتا ہے (۴/۲)۔ اور اس کے سوا کوئی نہیں جو مہیا کر سکے۔ (۳۴/۴۲)۔ میں کہتا ہوں کہ تم زیادہ نہیں، کم از کم اتنا ہی سوچو کہ اگر وہ پانی کے متعلق یہ قانون بنا دے کہ وہ

زمین کے اندر جائے تو اس کے اندر جذب ہو کر رہ جائے۔ اوپر آئے ہی نہیں، تو دنیا میں کوئی ذی حیات زندہ رہ سکتا ہے؟ (۲۱/۳۰)۔ یہ ہے وہ خدائے رحمٰن جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ (۶۷/۲۹)۔

(۱۴) لیکن میں نے جو اسے رحمٰن کہہ کر پکارا ہے تو یہ اس کی صفتِ رحمانیت کی نسبت سے ہے۔ ورنہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ تم اسے کس نام سے پکارتے ہو۔ اہمیت نام کی نہیں۔ اہمیت اس تصور کی ہے جو تم خدا کے متعلق رکھتے ہو۔ اس کا تصور صحیح ہو تو پھر اسے جس نام سے جی چاہے پکارو۔ ہر حسین نام جو اس کی کسی صفت کا مظہر ہو اسی کا ہے۔ (۱۷/۱۱۰)۔

وحی کے متعلق ارشادات

یہ ہے جو کچھ خدا پر ایمان کے سلسلہ میں ارشاد ہوا۔ لیکن خدا پر ایمان کے ضمن میں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا عملی فرق وحی پر ایمان سے پڑتا ہے۔ ایک شخص یہ مانتا ہے کہ خدا ہے اور اس کی یہ صفات ہیں لیکن وہ کہتا ہے، جہاں تک میرے معاملات کا تعلق ہے انہیں میں اپنی صوابدید کے مطابق خود طے کرتا ہوں۔ ان سے خدا کا کوئی تعلق نہیں تو ایسے شخص کو بھی خدا پر ایمان رکھنے والا نہیں سمجھا جائے گا۔ خدا پر ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے معاملات کو ان اصولوں کے مطابق طے کرے جنہیں خدا نے متعین کیا ہے اور اپنا جملہ کاروبارِ حیات ان حدود و قیود کے اندر رکھے جو خدا کی طرف سے مقرر ہوئی ہیں اور جس کا انسانوں کو علم، وحی کی رو سے دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص وحی کو نہیں مانتا تو اس کا خدا کو ماننا نہ ماننا یکساں ہے۔ اس لئے، ذات و صفاتِ خداوندی کے بعد، جو کچھ وحی کے متعلق فرمایا گیا، اب اسے دیکھئے۔ ارشاد ہوا۔

(۱) تم وحی کی کنہ و حقیقت کے متعلق دریافت کرنا چاہتے ہو! اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لو کہ وحی کا تعلق خدا کے عالمِ امر سے ہے۔ (۱۷/۸۵)۔ (اور تمہارا علم، عالمِ محسوسات تک محدود ہے۔ اس لئے اسے تو نبی کے سوا کوئی اور سمجھ نہیں سکتا۔ البتہ جو تعلیم وحی کی رو سے پیش کی جاتی ہے تم اسے سمجھ سکتے ہو۔ لہٰذا، تم اپنے سوال کو اسی حد تک محدود رکھو)۔

(۲) تم کہتے ہو کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ جو وحی میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں یعنی قرآن کریم۔ یہ میرے اپنے ذہن کی تخلیق نہیں۔ خدا کی طرف سے ہے۔ تو اس کا طریق بہت آسان ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ خدا کا کلام نہیں، کسی انسان کی تصنیف ہے تو تم اس جیسی کتاب تصنیف کر کے دکھاؤ۔ (۱۷/۸۸)

پورا قرآن نہیں، اس جیسی دس سورتیں مرتب کر کے بتاؤ۔ (۱۱/۱۳)۔ دس کو بھی چھوڑو۔ صرف ایک سورت بنا کر لاؤ۔ (۱۰/۳۸)۔ بات صاف ہو جائے گی۔

اور اگر تم ایسا نہ کر سکو، جیسا کہ ظاہر ہے کہ تم کبھی نہیں کر سکو گے، تو پھر تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسے اس خدا نے نازل کیا ہے جو تمام کائنات کے جملہ امور سے واقف ہے۔ (۲۵/۶)۔ اسے روح القدس میری طرف لے کر آیا ہے (۱۶/۱۰۲)۔ اس کی ہر بات حتمی اور یقینی ہے۔ (۲/۲)۔ جو شخص اس کی صداقتوں کو صحیح تسلیم کرتا ہے۔ یہ اسے منزلِ انسانیت کی طرف جانے والا صحیح راستہ دکھا دیتا ہے۔ اور اسے ان تمام نفسیاتی الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے جو اس کے لئے وجۂ اضطراب بنتی رہتی ہیں۔ (۴۱/۴۴)۔

(۳) (یاد رکھو! ہر سوال کا صحیح جواب صرف ایک ہوتا ہے۔ اس لئے) منزلِ انسانیت کی طرف لے جانے والا راستہ بھی ایک ہی ہے۔ اور وہ وہی راستہ ہے جس کی طرف خدا کی یہ کتاب راہ نمائی کرتی ہے (۲۲/۱۲۰؛ ۶/۱۵۳؛ ۱۰/۳۲)۔ اب تم سوچو کہ جو شخص اس راستے کو اختیار نہیں کرے گا اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیا اس سے زیادہ راہ گم کردہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ (۴۱/۵۲؛ ۴۶/۱۰)۔

(۴) میں تم سے اس قرآن کو زبردستی منوانا نہیں چاہتا۔ صداقت دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد خود مانی جاتی ہے۔ منوائی نہیں جا سکتی۔ اس لئے تم میں سے جس کا جی چاہے، قرآن کو اپنا ضابطۂ ہدایت تسلیم کر لے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ (۱۳/۲۷)؛ (۹/۲۵۶)۔ لیکن اگر تم اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو میں تمہیں متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں وہ حق ہے۔ اور حق کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ جب باطل اس کے بالمقابل آتا ہے تو یہ اسے اس طرح کچل دیا کرتا ہے کہ اس میں مقابلہ کی سکت باقی نہیں رہتی۔ اگر تم اس کی مخالفت پہ آمادہ ہو گئے تو تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ (۲۱/۱۸؛ ۳۴/۴۸ — ۴۹)۔

(۵) (تمہارے دل میں شاید یہ بھی خیال پیدا ہو کہ میں تمہاری مخالفت سے ڈر کر تم سے مفاہمت کے لئے آمادہ ہو جاؤں گا۔ اور مفاہمت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری خاطر اس ضابطۂ حیات میں کچھ رد و بدل کر لیا جائے۔ سو تم دل کے کانوں سے سن لو کہ اوّل تو میں خود ہی اس کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بفرضِ محال میں ایسا چاہوں بھی تو میں اس میں کسی قسم کی تبدیلی کر ہی نہیں سکتا۔ (۱۰/۱۵)۔ (یہ جب میری اپنی تخلیق ہی نہیں تو میں اس میں کسی تبدیلی کا مجاز کیسے ہو سکتا ہوں)۔

(۶) یہ تو محض خدا کے فضل و رحمت سے ہے جو اس نے اس قسم کا ضابطہ انسانوں کو عطا کر دیا ہے۔ سوائے نوعِ انسانی! تمہیں چاہیئے کہ خدا کی اس موہبت کبریٰ کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ (۱۰/۵۸)۔

خود اپنی ذات کے متعلق

خدا کی وحی ایک انسان کے ذریعے لوگوں تک آتی ہے۔ اس برگزیدہ ہستی کو رسول کہا جاتا ہے۔ اس وحی کا اور وحی کو دوسروں تک پہنچانے والے رسول کا باہمی تعلق کیا ہوتا ہے؟ یہ مقام بڑا اہم بھی ہے اور نازک بھی۔ اس اہم نکتہ کی وضاحت بھی خود نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ ارشاد ہوا۔

(۱) میں نے کہا ہے کہ وحی کا سرچشمہ اس کائنات سے ماوراء علم خداوندی ہے اور اس کا تعلق عالم امر سے ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خود میں بھی کوئی فوق الفطرت ہستی ہوں۔ بالکل نہیں۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں بس اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر خدا کی وحی ہوتی ہے۔ یہ وحی میرے کسب یا ہنر کا نتیجہ نہیں۔ یہ ایک وہبی نعمت ہے جو محض خدا کے فضل و کرم سے اس کی طرف سے مجھے ملی ہے (اور میں اسے تم تک پہنچا دیتا ہوں)۔ ([illegible])۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے میری راہ نمائی صراط مستقیم کی طرف کر دی ہے ([illegible])۔ اب میں باقی انسانوں کو اسی راستے پر چلنے کی دعوت دیتا ہوں اور میری یہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہوتی ہے ([illegible])۔ میں خود بھی اسی وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ ([illegible]) میں جو تم سے کہتا ہوں کہ تمہاری فلاں روش کا نتیجہ تباہی ہوگا تو اس کا علم بھی مجھے قرآن ہی کے ذریعے ہوا ہے۔ ([illegible])۔ میرا منصب یہ ہے کہ میں تمہیں زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کر دوں۔ ([illegible])۔ میں ایک نذیر ہوں۔ ([illegible])۔

(۲) (میں نے جو کہا ہے کہ) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں (تو اس کی وضاحت میں سن لو کہ) میرے پاس نہ اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ نہ مجھے علم غیب حاصل ہے۔ میں خدا کی وحی کا اتباع کرتا ہوں اور یہی میری دعوت کی بنیاد ہے۔ ([illegible])، ([illegible] : [illegible])۔ تمہارا مجھ سے یہ مطالبہ کہ میں تمہیں کوئی معجزہ دکھاؤں بے معنی بات ہے۔ جبکہ میں بار بار کہتا ہوں کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ ([illegible]) میں انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اس لئے مجھے انہی جیسا ایک انسان ہونا چاہیئے۔ اگر زمین پر فرشتے بستے تو پھر ان کی طرف ایک فرشتہ رسول بن کر آتا۔ ([illegible])۔

(۳) اسے اچھی طرح سن لو کہ میں تمہارے لئے کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ ([illegible]) ([illegible])۔ تمہارے لئے نفع یا نقصان کا اختیار تو ایک طرف میں خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب خدا کے مقرر کردہ قوانین کی رو سے ہوتا ہے۔ ([illegible] [illegible]) اگر میں بھی خدا کے کسی

قانون کی خلاف ورزی کروں تو اس کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں۔ (۶/۱۵ ؛ ۳۹/۱۳)۔ مجھے اس سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ (۷۲/۲۲)۔ (ظاہر ہے کہ جب میری اپنی یہ حالت ہے تو میں کسی اور کو قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے کے نتائج سے کیسے بچا سکتا ہوں!) میں ہر خطرات سے حفاظت کے لئے قوانینِ خداوندی کے دامن میں پناہ لیتا ہوں۔ (۲۳/۹۷-۹۸ ؛ ۱۱۳/۱ ؛ ۱۱۴/۱)۔

(۴) اسے بھی سمجھ لو کہ میں جب سیدھے راستے پر چلتا ہوں تو وہ وحی کی بدولت ہوتا ہے۔ اور اگر مجھ سے کوئی سہو یا خطا ہو جائے تو چونکہ اس کا ذمہ دار میں خود ہوں گا۔ (خدا کی وحی نہیں ہوگی)۔ اس لئے اس کا خمیازہ بھی مجھے ہی بھگتنا پڑے گا۔ (۳۴/۵۰)۔

(۵) (تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میرے دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا ہے؟ تم ذرا سوچو کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا) میں نے اس دعوے سے پہلے اپنی ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس قسم کی زندگی سچے انسان کی ہوتی ہے یا جھوٹے اور فریب کار کی؟ (۱۰/۱۶)۔

(۶) اور پھر اسے بھی سوچو کہ میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں اس کا کوئی معاوضہ تم سے نہیں مانگتا۔ (۱۰/۷۲ ؛ ۳۴/۴۷)۔ (لہٰذا اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس میں میرا اپنا کوئی مفاد مضمر نہیں۔ میں یہ تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتا ہوں)۔ تم میں سے جو شخص غلط راستہ چھوڑ کر خدا کی طرف جانے والی راہ اختیار کرے گا تو یہی میری محنت کا معاوضہ ہو جائے گا۔ (۲۵/۵۷)۔ خدا کی طرف جانے والی راہ پر گامزن ہونے کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم جو اس وقت باہمی خون ریزیوں اور فساد انگیزیوں میں الجھے رہتے ہو۔ اسے چھوڑ کر، باہمی قرابتداری کے حقوق کی نگہداشت کرنے لگ جاؤ گے۔ یہ بھی میری محنت کا معاوضہ ہوگا۔ (۴۲/۲۳)۔ یعنی وہ معاوضہ جس کا نفع خود تمہاری اپنی ذات کو ہوگا۔ (۳۴/۴۷)۔

(۷) (اس کے بعد یہ سمجھ لو کہ میری دعوت کا بنیادی نقطہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ) اطاعت و محکومیت صرف ایک خدا کی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس کے سوائے کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ مجھے خدا کی طرف سے اس کی تاکید ہوئی ہے اور اسی کی اطاعت میں خود بھی کرتا ہوں۔ (۳۹/۱۱-۱۵)۔ مجھے اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں اس کے علاوہ، کسی اور کے احکام و قوانین کی اطاعت کروں۔ (۶/۱۴)۔ یہی نہیں کہ اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت نہ کروں۔ بلکہ یہ بھی کہ اس کی اطاعت میں کسی اور کی اطاعت کو شریک نہ کروں۔ (۱۳/۳۶)۔ میری طرف جو وحی آتی ہے اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ تمہارا اِلٰہ صرف ایک خدا ہے۔ (۱۸/۱۱۰)۔

(۸) میری دعوت تو یہ ہے (۲۳/۴۷)۔ اور تم چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر اوروں کی اطاعت

کرلوں ؟ (۶/۱۶۴-۱۶۵)۔ انسان جب کسی کے سامنے جھکتا ہے تو اس لئے کہ اسے اس سے نفع کی امید ہوتی ہے، یا وہ کسی نقصان سے بچنا چاہتا ہے۔ لیکن جب اس کا اختیار کسی اور کو ہے ہی نہیں، تو پھر اس کے سامنے جھکا کیوں جائے۔ (۶/۷۱ ; ۱۰/۱۰۶)۔ اور پھر وہ خدا مجھ سے کچھ کھانے کو بھی نہیں مانگتا۔ (۶/۱۴)۔ لہٰذا سوچو کہ اس قسم کے خدا کو چھوڑ کر، باطل خداؤں کو معبود بنا لینا، جہالت نہیں تو اور کیا ہے ؟ (۳۹/۶۴)۔

(۹) بہرحال، میں نے اپنی زندگی اسی مشن کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ میرا مرنا جینا سب اسی کے لئے ہے۔ (۶/۱۶۲-۱۶۳)۔ اگر تم بھی اسی طرح شرفِ انسانیت حاصل کرنا چاہتے ہو تو جس راستے پر میں چل رہا ہوں تم بھی اس پر چلتے جاؤ۔ (۶/۱۵۳)۔ اگر تم نے اس کے بجائے اور راستے اختیار کر لئے تو وہ راستے تمہیں خدا کی طرف نہیں لے جائیں گے۔ (۶/۱۵۳)۔ [ان پر چل کر تم منزلِ مقصود انسانیت تک نہیں پہنچ سکو گے]۔

(۱۰) میں نے صحیح بات تم تک پہنچا دی ہے۔ اب یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم اسے تسلیم کر دیا اس سے انکار کر دو۔ میں تم پر کوئی داروغہ مقرر نہیں کیا گیا۔ (۶/۱۰۴)۔ میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں، دلیل و برہان کی رو سے کہتا ہوں۔ (۶/۵۷)۔ اگر تم اس سے اختلاف کرتے ہو تو میرا مطالبہ یہ ہے کہ تم بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں، میری طرح دلیل و برہان پیش کرو۔ (۲/۱۱۱ ; ۲۱/۲۴ ; ۲۷/۶۴)۔ لیکن یہ بات میں تم سے ابھی کہے دیتا ہوں کہ تم دلائل خداوندی کے خلاف کوئی معقول دلیل پیش نہیں کر سکو گے۔ اس لئے کہ فیصلہ کن حقیقت تک پہنچانے والی دلیل صرف خدا کی طرف سے مل سکتی ہے۔ (۶/۱۴۹-۱۵۰)۔ اسی کو حقیقی علم کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ علم رکھنے والا اور بے علم کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (۳۹/۹)، جس طرح اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے۔ (۶/۵۰)۔ نہ ہی تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ (۱۳/۱۶)۔

(۱۱) لیکن اگر تم اس طرح دلیل و برہان کی رو سے بات نہیں کرنا چاہتے تو دوسرا طریق یہ ہے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو۔ مجھے میرے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ اور اتنا انتظار کرو کہ ان پروگراموں کا نتیجہ سامنے آجائے۔ یہ نتیجہ خود بتا دے گا کہ کس کا دعوےٰ سچا ہے اور کس کا جھوٹا۔ کس کی راہ کامیابیوں کی طرف لے جاتی ہے اور کس کی تباہیوں کی طرف۔ (۱۱/۱۲۱-۱۲۲) ; (۳۹/۳۹) ; (۶/۱۳۶)۔ تم بھی انتظار کرو۔ میں بھی انتظار کروں گا۔ (۶/۱۵۸) ; (۲۰/۱۳۵) ; (۷/۱۵۹) ; (۵۲/۳۱)۔ اعمال کے نتائج ایسی کسوٹی ہے جس میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ (۲/۱۴۷)۔

(۱۲) لیکن اگر تم نہ وہ کرنا چاہتے ہو نہ یہ، اور صرف دھاندلی سے اپنی بات منوانا چاہتے ہو اور نشۂ قوت میں بدمست ہو کر میری دعوت کو کچل دینے کا ارادہ رکھتے ہو، تو تم یہ بھی کر دیکھو۔ میں تمہاری دھمکیوں سے ڈر کر حق بات کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ تم خود بھی آجاؤ اور اپنے ساتھ اپنے حمایتیوں کو

بھی بلاؤ، اور جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر دیکھو۔ (۷/۱۹۵)۔ پھر دیکھو کہ تمہارے معبودانِ باطل تمہاری کچھ بھی مدد کرتے ہیں؟ (۳۵/۴۰) ؛ (۳۴/۲۲)۔ تمہارے اور میرے درمیان فیصلہ خدا کے قانون کے مطابق ہوگا۔ (۳۴/۲۶)، اور وہ قانون یہ ہے کہ جب حق سامنے آجائے تو باطل کبھی مقابل میں ٹھہر نہیں سکتا۔ (۱۷/۸۱)۔ میرے لئے اُسی کی نگرانی کافی ہے۔ (۶/۱۹) ؛ (۱۳/۴۳) ؛ (۱۰/۹۹) ؛ (۲۹/۵۲)۔

(۱۳) اور آخر میں، میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں — صرف ایک بات۔ اور وہ یہ کہ تم خدا کے لئے ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ — اور پھر سوچو! جو کچھ میں کہتا ہوں اس پر غور و فکر کرو۔ (۳۴/۴۶)۔ اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا تو تم پر کامیابی کی راہیں کشادہ ہونے کا امکان ہو جائے گا)۔

آنے والا انقلاب

(۱) میں جو تم سے اس حتم و یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ حق غالب آ کے رہے گا اور تم بری طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے تو یہ اس لئے ہے کہ مجھے خدا کے قانونِ مکافات پر پورا پورا یقین ہے۔ انسانی اعمال کے نتائج سامنے آ کر رہتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ لہٰذا میں جس انقلاب سے تمہیں متنبہ کرتا ہوں، وہ آ کر رہے گا۔ (۳۴/۴۸ ؛ ۵۱/۵)۔

(۲) تم کہتے ہو کہ اگر اس نے آنا ہے تو وہ فوراً کیوں نہیں آجاتا۔ یہ اس لئے کہ تم خدا کے اس قانون سے واقف نہیں کہ عمل اور اس کے نتیجہ میں ایک وقفہ ہوتا ہے جس کے گذرنے کے بعد ہی نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں۔ (۵/۱۹)۔ جب یہ مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر اس انجام کے سامنے آنے میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ (۴۹-۱۰/۴۸ ؛ ۷/۳۴ ؛ ۲۹/۵۳-۵۴)۔ چونکہ مجھے خود علم نہیں کہ وہ مہلت کا عرصہ کس قدر طویل ہے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ساعت کب آئے گی۔ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ (۷/۱۸۷)۔ ہو سکتا ہے کہ وہ قریب ہی ہو۔ (۱۷/۵۱ ؛ ۲۱/۱۰۹ ؛ ۲۶-۲۷/۴۲ ؛ ۳۳/۶۳ ؛ ۶۷-۲۶/۷۲ ؛ ۷۲/۲۵)۔ اگر اس ساعت کا لانا میرے اختیار میں ہوتا تو معاملہ کبھی کا طے ہو چکا ہوتا۔ (۶/۵۸)۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم اس کے لئے اس قدر جلدی کیوں مچاتے ہو۔ اس کا آنا تمہارے لئے تباہی کا موجب ہوگا۔ (۷۹-۳۲/۴۸)۔ وہ تو ایک عظیم حادثہ ہے۔ (۳۸/۶۷)۔ اس مہلت کے عرصہ میں تم سامانِ زیست سے مستفید ہو سکتے ہو۔ لیکن تمہارا انجام جہنم کی تباہی ہوگا۔ (۱۴/۳۰ ؛ ۳۹/۸)۔

(۳) پھر ارشاد ہوا کہ تم میرے مشن کی مخالفت کے لئے مخالفانہ تدبیریں کرتے ہو۔ تم ایسا کرتے

رہو۔ لیکن یاد رکھو کہ میرے خدا کی تدبیر کہیں محکم، اور اس کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے (۱۰/۲۱)۔

(۴) اسکے ساتھ ہی میں تم سے یہ بھی کہدینا چاہتا ہوں کہ نہ تم سے پوچھا جائیگا کہ ہم کیا کرتے تھے۔ نہ ہم سے یہ سوال ہوگا کہ تم کیا کرتے تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اسی کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ([illegible]) ; ([illegible])۔ لہٰذا بالفرض محال اگر (جیسا کہ تم چاہتے ہو) خدا مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک بھی کردے۔ یا ہمیں اپنی رحمت سے نوازے۔ تو اس سے تمہارے مآل و انجام پر کچھ فرق نہیں پڑسکتا۔ تم اس تباہی سے بچ نہیں سکتے جو تمہاری غلط روش کے نتیجہ میں تمہارے اوپر مسلط ہونے والی ہے۔ ([illegible])۔ تم خواہ مخواہ جھگڑے نکالتے ہو۔ یہاں سب فیصلے اعمال کے مطابق ہوتے ہیں۔ ([illegible])۔

(۵) تم کہتے ہو کہ میں اپنی طرف سے باتیں وضع کر کے انہیں خدا کی طرف منسوب کر دیتا ہوں۔ اس سلسلہ میں تم خدا کے اس قانون کو ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ افترا کرنے والوں کو کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا میرے پروگرام کا انجام خود بتادے گا کہ میں افترا کرتا تھا یا سچ کہتا تھا۔ ([illegible] ; [illegible])

(۶) پھر اسے بھی اچھی طرح سن رکھو کہ خدا تو یہی چاہتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔ لیکن جب لوگ جرائم پر اتر آئیں تو وہ ان کے تباہ کن نتائج سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔ ([illegible])۔

مخالفین عرب (کفار و مشرکین) سے خطاب

نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت کا آغاز مکہ سے کیا اور یہ آواز یہاں سے نکل کر اس کے اردگرد پھیلی۔ اس لئے اس کی سب سے پہلے مخالفت بھی یہیں سے شروع ہوئی۔ مکہ اور اس کے گرد و نواح میں جو لوگ بستے تھے وہ کسی سابقہ نبی کی دعوت کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے۔ وہ سرے سے نبوت کے تصور ہی سے انکار کرتے تھے اور متعدد دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتے تھے۔ اس اعتبار سے انہیں کفار و مشرکین کی اصطلاحات سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ ان سے آپ نے فرمایا:-

(۱) اے لوگو! اچھی طرح سمجھ لو کہ میری دعوت کیا ہے؟ میں خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس کتاب میں مجھے حکم یہ دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔ اس لئے کہ خدا کسی ایک گروہ کا خدا نہیں۔ وہ تمہارا بھی نشو و نما دینے والا ہے اور میرا بھی۔ میرا تم سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں۔ یہاں سب فیصلے خدا کے قانون مکافات کی رو سے ہوتے ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ جو کچھ میں کرتا ہوں اس کا انجام میرے سامنے آجائے گا۔ ([illegible])۔ اس کے ساتھ ہی

اسے بھی سن رکھو کہ میں تمہارے ساتھ کسی مفاہمت کے لئے تیار نہیں۔ جن ہستیوں کی تم نے معبودیت اختیار کر رکھی ہے میں انہیں معبود تسلیم کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ اور تمہاری روش یہ بتا رہی ہے کہ جس خدا کی محکومیت میں نے اختیار کی ہے، اس کی محکومیت اختیار کرنے پر تم آمادہ نہیں۔ اب تمہاری روش کے نتائج تمہارے سامنے آجائیں گے میری روش کے میرے سامنے۔ ([illegible])۔

(۲) تم سمجھتے ہو کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، اس لئے جائز و ناجائز، ہر طریق سے دنیاوی مفاد حاصل کر لو۔ لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ اس سے تم کس قدر خود اپنا نقصان کرتے ہو۔ تمہیں اپنے اعمال بڑے سہانے نظر آتے ہیں حالانکہ نتائج کے اعتبار سے وہ بڑے خطرناک ہیں۔ ([illegible])۔

(۳) تم کہتے ہو کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو وہی صحیح راستہ ہے۔ لیکن صحیح اور غلط کے لئے کسی کا ذاتی خیال تو کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اس کے لئے خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسوٹی ہی صحیح معیار ہو سکتی ہے۔ اس پر پرکھ کر دیکھو کہ کھوٹا کیا ہے اور کھرا کیا۔ ([illegible])۔

(۴) تم کہتے ہو کہ میں اگر اپنے دعوے میں سچا ہوں تو کوئی معجزہ دکھاؤں۔ ([illegible])۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تمہاری آنکھوں میں نورِ بصیرت نہیں رہی۔ ورنہ صاحبِ بصیرت کے لئے تو کائنات میں قدم قدم پر معجزات بکھرے پڑے ہیں۔ ([illegible])۔ دیکھنے والوں کے لئے وہ معجزات کم نہیں۔ ([illegible])۔

(۵) اگر تمہیں ان بکھری ہوئی آیاتِ خداوندی میں صداقت کی شہادت نظر نہیں آتی، تو تم ادھر ادھر چلو پھرو اور اقوامِ سابقہ کی اجڑی ہوئی بستیوں پر نگہِ بصیرت ڈال کر دیکھو کہ جن لوگوں نے حق کی مخالفت کی تھی ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ ([illegible])۔ لیکن اگر اس قسم کے واضح دلائل اور بین شہادات کے بعد بھی تم قوانینِ خداوندی کی مخالفت سے باز نہیں آؤ گے تو اس کا نتیجہ بہت جلد تمہارے سامنے آجائیگا۔ ([illegible])۔ یعنی جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ ([illegible])۔ غلط روش کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا۔ ([illegible])۔ خدا کا قانونِ مکافات کسی کی رو رعایت نہیں کیا کرتا ([illegible])۔

(۶) تم میری مخالفت یوں کرتے ہو جیسے میں نے دنیا میں پہلی بار دعویٰ نبوت کیا ہے۔ یاد رکھو میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی مختلف اقوام کی طرف رسول آتے رہے ہیں۔ میں بھی انہی کی طرح، تم تک خدا کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔ اور خود بھی اسی وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ خدا کی وحی کی مخالفت کا نتیجہ جس طرح پہلی قوموں کے سامنے آیا تھا، اسی طرح تمہارے سامنے آجائے گا۔ ([illegible])۔

(۷) پھر فرمایا۔ تم جو میری مخالفت میں یوں دن رات لگے رہتے ہو، تو ذرا سوچو کہ تم اگر مجھے تکلیف پہنچانے میں کامیاب بھی ہو جاؤ، تو بھی وہ تکلیف اس تباہی کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہوگی جو تمہارے اعمال کے

بدلے میں تمہیں پہنچے گی۔ (۲۳/۲۲)۔ ذرا غور کرکے بتاؤ کہ تمہارے لئے اس قسم کی تباہی اچھی ہے یا اس جنت کی زندگی جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں۔ (۲۵/۲۵)۔

(۸) پھر تم اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جس صحیح راستے کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ لہٰذا تمہارا جی چاہے تو اسے اختیار کرلو۔ جی چاہے اس سے انکار کردو۔ (اس سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا)۔ (۱۰/۱۰۷)۔

(۹) آخر میں آپؐ نے ان سے کہا کہ میں نے تم سے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ (۱۰/۱۰۸)۔ میرا تم پر سلام ہو۔ تم عنقریب دیکھ لوگے کہ میں کیا کہتا تھا۔ (۴۳/۸۹)۔

اہل کتاب سے خطاب

اس کے بعد آپؐ، مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے۔ وہاں ایک نئے گروہ کی مخالفت سے سابقہ پڑا۔ اور یہ گروہ تھا اہل کتاب کا جن میں یہودی اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ وہ کھل کر سامنے کم آتے تھے۔ خفیہ سازشیں زیادہ کرتے تھے اور اس کی پشت پر ان کے مذہبی پیشوا۔ علماء و مشائخ ــــ تھے۔ چونکہ اسلامی نظام میں ان کے اقتدار کی مسندیں باقی نہیں رہتی تھیں، اس لئے وہ اس کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ ہماری طرف خدا کے رسول آتے رہے اور ہمارے پاس خدا کی طرف نازل کردہ کتابیں بھی ہیں۔ اس کے بعد ہمیں ایک نئی رسالت پر ایمان لانے کی ضرورت کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپؐ نے ان کے باطل عقائد کو ایک ایک کرکے گنایا اور کہا کہ تم بتاؤ کہ خدا کی طرف سے نازل شدہ تسلیم اس قسم کی ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔

(۱) اے یہودیو! تم کہتے ہو کہ تمہیں چند دنوں سے زیادہ جہنم کا عذاب نہیں ہوگا۔ (میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم نے اس کی بابت خدا سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر تمہارا یہ دعویٰ درست ہوسکتا ہے کیونکہ خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں جایا کرتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمہیں خدا نے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں دیا۔ اس لئے) تم خدا کے متعلق ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔ (۲/۸۰)۔

(۲) پھر فرمایا کہ تم کہتے ہو کہ جنت تمہارے لئے مخصوص ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو تم مرنے کی تمنا کیوں نہیں کرتے (تاکہ تم جلدی سے جنت میں پہنچ جاؤ)۔ (۲/۹۴ و ۶۲/۶)۔

(۴) اے یہود اور نصاریٰ! تمہارا دعویٰ ہے کہ تم خدا کی چہیتی اولاد ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو تم بتاؤ کہ تمہارے جرائم کے بدلے میں تم پر خدا کا عذاب کیوں آتا رہا۔ (کوئی اپنی چہیتی اولاد کو بھی مبتلائے عذاب کیا کرتا ہے؟) (۵/۱۸)

(۴) پھر ارشاد ہوا۔ اے یہود یو! تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اپنے انبیاء کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ اس لئے تمہیں قرآن پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ (میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ) اگر تم واقعی اپنے انبیاء پر ایمان رکھتے تھے تو تم ان کے درپے آزار کیوں ہوتے تھے اور انہیں قتل کیوں کر دیا کرتے تھے؟ (۲/۹۱ ؛ ۳/۱۸۳)۔

(۵) اور اے عیسائیو! تم نے (جناب) مسیحؑ کو خدا بنا رکھا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ اگر خدا (حضرت) مسیحؑ اور ان کی والدہ، بلکہ جو کوئی بھی زمین پر ہے ان سب کو ہلاک کر دینا چاہتا تو اسے کون روک سکتا تھا؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جملہ کائنات میں اقتدار و اختیار اسی کو حاصل ہے! (۵/۱۷)۔

(۶) پھر ان سے کہا۔ تم کہتے ہو کہ نجات اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو یہودی یا نصرانی ہو۔ (یہ تمہاری اپنی گروہ بندیوں کے تعصب کا نتیجہ ہے)۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ صحیح دین، مسلک ابراہیمیؑ کا تھا جس میں شرک کا شائبہ تک نہ تھا۔ اسے اچھی طرح سن رکھو کہ ہمارا مسلک کیا ہے؟ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ان کتب سابقہ پر بھی جو آلِ ابراہیمؑ پر نازل ہوئی تھیں — یعنی اسماعیلؑ — اسحٰقؑ — یعقوبؑ اور ان کے افراد خاندان پر نیز جو موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء کو ملی تھیں۔ ہم ان میں سے کسی میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ اس طرح ہم خدا کے سچے دین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ (۲/۱۳۵)۔ سو تم بھی اسی طرح مسلک ابراہیمیؑ کی پیروی کرو۔ (۳/۹۵)۔

(۷) (اے بنی اسرائیل (کے مذہبی پیشواؤ!) تم حلال اور حرام کی لمبی چوڑی فہرستیں پیش کر کے کہتے ہو کہ یہ خدائی احکام ہیں)۔ تم اپنے دعوے کی تائید میں تورات پیش کرو اور دکھاؤ کہ اس میں یہ کچھ کہاں لکھا ہے۔ یاد رکھو! یہ سب خدا پر افترا ہے اور ظالمین کا شیوہ۔ (۳/۹۴)۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ نہ تم خود ہی خدا کی راہ پر چلنا چاہتے ہو نہ اور لوگوں کو اس راہ پر چلنے دینا چاہتے ہو۔ یاد رکھو! جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے بے خبر نہیں۔ (۳/۹۸)۔

(۸) تم کہتے ہو کہ کسی انسان کی طرف خدا کی وحی کس طرح آ سکتی ہے؟ تم یہ بتاؤ کہ جو کتاب (حضرت) موسیٰؑ نے پیش کی تھی وہ کس کی طرف سے نازل ہوئی تھی؟ اسے خدا ہی نے نازل کیا تھا اور ایک انسان ہی کی طرف نازل کیا تھا۔ (پھر اس کتاب کے خلاف یہ اعتراض کیا معنی رکھتا ہے کہ یہ ایک انسان کی طرف کیوں نازل ہوئی ہے۔ (۶/۹۱)۔

(۹) میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے جو ہماری مخالفت پر کمر باندھ رکھی ہے تو ہمارے کس جرم کی بنا پر؟ اس جرم کی بنا پر کہ ہم خدا پر ایمان کیوں لاتے ہیں۔ ہم اس کی وحی کو تسلیم کیوں کرتے ہیں، درانحالیکہ تم میں سے اکثر اس صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر چکے ہیں۔ یاد رکھو! اس کا نتیجہ بڑی سخت تباہی ہوگا۔ ([illegible])۔

(۱۰) تم اپنے دین میں غلو کرتے ہو۔ ([illegible]) - اگر تم اس غلو کو چھوڑ کر اعتدال پر آجاؤ تو تم دیکھو کہ تم میں اور ہم میں کس قدر مشترک اقدار ہیں۔ ایک خدا کی عبودیت اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کرنا۔ ([illegible])۔ اب بتاؤ کہ تم اس روش کو اختیار کرنا چاہتے ہو یا نہیں۔ اگر ایسا چاہتے ہو تو آؤ ہمارے ساتھ مل کر راہ راست پر چلو۔ اگر نہیں چاہتے تو اس کا خمیازہ تم خود بھگتو گے۔ میں نے تم تک خدا کی بات پہنچا دی۔ ([illegible])۔ اگر تم اس پر بھی نہیں مانتے تو پھر تمہاری اور ہماری راہیں جدا جدا ہوگئیں۔ ([illegible])۔

بدوی قبائل سے خطاب

مدینہ کے گرد و نواح میں بہت سے بدوی قبائل بھی بستے تھے۔ جب مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہونے لگیں تو وہ قبائل بھی اسلامی سوسائٹی میں شامل ہونے لگ گئے۔ وہ اسلام کو اچھی طرح سمجھے نہیں تھے۔ اس کی شان و شوکت دیکھ کر ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ ان سے ارشاد ہوا کہ

(۱) تم ابھی یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ تم یہی کہو کہ ہم نے اسلامی حکومت کی اطاعت اختیار کر لی ہے۔ (ایمان تو دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد صداقت کو قبول کرنے کا نام ہے اور تمہاری یہ حالت ہے کہ) ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ ہاں تم قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے رہو تو رفتہ رفتہ تمہارے دل کی حالت بدل جائے گی۔ اُس وقت یہ کہنا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ([illegible])۔

منافقین سے خطاب

یہ بدوی قبائل ایمان کے کچے تو تھے لیکن بالعموم نیت کے بُرے نہیں تھے۔ لیکن ایک اور گروہ تھا جو مسلمانوں میں انتشار اور تخریب پیدا کرنے کے لئے، اسلام کا نقاب اوڑھ کر اس جماعت میں داخل ہوگیا تھا۔ یہ منافقین کا گروہ تھا اور سب سے زیادہ نقصان رساں۔ منافق کے متعلق مشکل یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص کسی کے دل میں گھس کر دیکھ نہیں سکتا کہ اس کی نیت اور ارادہ کیا ہے۔ انسان کو دوسروں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے اسی طرح حضورؐ بھی ان پر اعتماد کر لیتے تھے۔ لیکن جب حالات ان کی نقاب کشائی کرتے تو آپ انہیں سخت

زجر و توبیخ کرتے۔ ان سے کہا جاتا کہ

(۱) تمہاری منافقت کا یہ عالم ہے کہ تم بظاہر جماعتِ مومنین کے ساتھ ہو اور تمہارے دلوں کی یہ حالت کہ اگر اس جماعت کو کامیابی نصیب ہوتی ہے تو تم جل بھن جاتے ہو۔ اور اگر اس پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو اس سے تمہیں بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یاد رکھو! ہماری جماعت کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کئے چلی جائیگی اور تم اپنے حسد اور غصہ کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔ (۳/۱۱۸)۔

(۲) تم قسمیں کھا کھا کر کہتے ہو کہ تم دل سے ہمارے ساتھ ہو۔ قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ احکام کی اطاعت خود بتا دے گی کہ تم ہمارے ساتھ ہو یا نہیں۔ (دعوئی ایمان کی صداقت کی شہادت انسان کا عمل ہوتا ہے نہ کہ قسمیں)۔ (۲۴/۵۳)۔

(۳) بات یہ ہے کہ تمہاری نگاہ صرف دنیاوی مفاد پر رہتی ہے۔ زندگی کے بلند مقاصد پر نہیں رہتی۔ حالانکہ ان بلند مقاصد کے مقابلہ میں دنیاوی مفاد کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ (۴/۷۷)۔

خود اپنی جماعت سے خطاب

لیکن حضورؐ کے حقیقی مخاطب تو خود جماعتِ مومنین کے افراد تھے جن کی تعلیم و تربیت آپ کے فرائضِ رسالت میں سرفہرست آتی تھی۔ آپ انہیں تاکید فرماتے کہ

(۱) تم پر جو فرائض خدا نے عائد کئے ہیں ان کی ادائیگی کرو۔ تم دیکھو گے کہ اس سے تمہاری زندگی کس قدر حسین ہو جاتی ہے۔ (۳۹/۱۰)۔

(۲) میں جس راستے پر چل رہا ہوں تم بھی میرے پیچھے پیچھے اسی راستے پر چلتے رہو۔ (۳/۳۱)۔ خدا اور رسول کی اطاعت کرو۔ اس کا نتیجہ دنیا میں حکومت و اقتدار اور آخرت میں سرفرازی و سربلندی کی زندگی ہوگا۔ (۲۴/۵۳ — ۵۵)

(۳) لیکن اطاعت کوئی وقتی فریضہ نہیں۔ مسلمان کی ساری زندگی حق کی خاطر جدوجہد اور سعی و عمل کی زندگی ہے۔ اس لئے یاد رکھو! اگر تمہارے نزدیک دنیا کی کوئی شے بھی جہاد سے زیادہ عزیز ہو گئی تو تم مومن نہ رہے۔ پھر جو حشر دوسری قوموں کا ہوتا ہے وہی تمہارا ہوگا۔ (۹/۲۴)

(۴) لیکن اگر کبھی بھول چوک سے کوئی لغزش ہو جائے تو اس سے افسردہ خاطر نہ ہو جایا کرو۔ اس کی اصلاح کی فکر کرو۔ اس سے اس نقصان کی بھی تلافی ہو جائے گی جو اس لغزش سے واقع ہو گیا تھا اور سامانِ رحمت بھی

عطا ہوگا - ([illegible])۔

(۵) (یاد رکھو۔ میں رہبانیت کی تعلیم دینے کے لئے نہیں آیا جو دنیا کی زیب و زینت کی چیزوں کو تم پر حرام قرار دیدوں)۔ دنیاوی زینت و متاع، انسان کے لئے وجہ کشش ہیں اور ان میں کوئی برائی نہیں۔ اس میں اتنی احتیاط ضروری ہے کہ جب ان میں اور خدا کے عائد کردہ کسی فریضہ میں ٹکراؤ ہو تو اس وقت ترجیح فریضہ خداوندی کو دینی چاہیئے کہ ان فرائض کو متاع دنیا کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ([illegible])

(۶) یاد رکھو! خبیث و طیب کبھی برابر نہیں ہو سکتے خواہ خبیث کی کثرت انسان کو کتنا ہی فریب کیوں نہ دے۔ لہٰذا تم ہمیشہ طیب کی راہ اختیار کرو۔ یہی عقل و دانش کا تقاضا ہے۔ ([illegible])۔

حرام و حلال کے متعلق

دین میں حلال و حرام کی تمیز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کسی شے کو حرام قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی آزادی پر ابدی طور ایک پابندی عائد کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کسی بہت بڑی اتھارٹی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں، اس مجموعہ میں بڑے واضح ارشادات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ فرمایا:

(۱) خدا نے رزق حلال پیدا کیا تھا لیکن لوگوں نے اپنی توہم پرستیوں سے، اس میں سے خواہ مخواہ بہت سی چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا۔ ([illegible])۔

(۲) اے وہ لوگو! جو خدا کے عطا کردہ رزق کو حرام قرار دیتے ہو، میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس بارے میں تمہارے پاس خدا کی طرف سے نازل کردہ کوئی سند ہے؟ ([illegible])۔ میں اس باب میں خدا کی شہادت چاہتا ہوں۔ ([illegible])۔

(۳) یاد رکھو! خدا نے تم پر تمام طیب چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔ ([illegible])۔ اور جنہیں اس نے حرام ٹھہرایا ہے ان کی وضاحت اپنی کتاب میں کر دی ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ مردار — بہتا ہوا لہو۔ لحم خنزیر۔ اور ہر وہ شے جسے خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ ان کے علاوہ اور کوئی شے نہیں جسے خدا نے حرام قرار دیا ہو۔ ([illegible])۔ میں تو اس کی کتاب میں، ان کے علاوہ کسی اور چیز کو حرام نہیں پاتا۔ نہ ہی خدا کے سوا کسی اور کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ حتیٰ کہ خود مجھے بھی اس کا حق حاصل نہیں۔ ([illegible])۔

(۴) یہ لوگ جو بیٹھے بیٹھے یونہی حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کرنے لگ جاتے ہیں، میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجھے بتاؤ کہ، وہ کون ہے جو ان چیزوں کو جنہیں خدا نے انسانوں کے لئے وجہ زینت

اور خوشگوار بنایا ہے، حرام قرار دیدے؟ (۵/۹۳)۔

معاشرتی زندگی سے متعلق احکام

حرام و حلال کے علاوہ، زندگی کے عام معاشرتی معاملات کے متعلق بھی احکام دیئے گئے۔ مثلاً فرمایا۔

(۱) خدا نے واجب قرار دیا ہے کہ تم شرک نہ کرو۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے مار نہ ڈالو۔ نہ ہی انہیں صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رکھو۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلے بندوں ہو یا چھپ کر۔ کسی جان کو ناحق تلف نہ کرو۔ یتیموں کا مال ناحق مت کھاؤ۔ اپنے وزن اور پیمانے درست رکھو۔ ہمیشہ عدل و انصاف کی بات کرو خواہ اس کی زد تمہارے اپنوں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ جو عہد تم اپنے خدا سے کرو اسے ضرور پورا کرو۔ (۶/۱۵۲ — ۱۵۳) و (۵/۳۳)۔

(۲) پھر فرمایا۔ ہمیشہ اچھی بات کرو۔ یاد رکھو شیطان تم میں باہمی نزاع اور فساد پیدا کرنا چاہتا ہے وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اس کے حربوں سے بچو۔ (۱۷/۵۳)۔

(۳) خمر اور میسرہ بڑی نقصان رساں چیزیں ہیں۔ ان سے مجتنب رہو۔ (۵/۹۳)۔

(۴) یتیموں کی اصلاح کرو۔ یہ نہایت ضروری ہے۔ (۲/۲۲۰)۔

(۵) ہمیشہ عدل کرو۔ اور قوانین خداوندی کی اطاعت خلوص دل سے کرو۔ (۷/۲۹)

(۶) اپنی نگاہوں کو کبھی بیباک نہ ہونے دو۔ بُری نظر سے کسی کی طرف نہ دیکھو۔ نہ مرد عورتوں کی طرف اس طرح دیکھیں، نہ عورتیں مردوں کی طرف۔ (۲۴/۳۰ — ۳۱)۔

(۷) جو کچھ تمہاری ضروریات سے زائد ہے، وہ سب دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھو۔ (۲/۲۱۹)۔

(۸) جب تمہیں اپنے طور پر دوسروں کی مدد کرنے کی ضرورت ہو، تو اس کی ابتدا اپنے قریب ترین حلقہ سے کرو۔ مثلاً اپنے والدین اور دیگر اقربین کو دیکھو۔ پھر معاشرہ کے یتیموں اور مسکینوں کا جائزہ لو۔ اور مسافروں تک کی بھی خبر گیری کرو۔ (۲/۲۱۵)۔

(۹) چاند (سورج) دنوں کی گنتی شمار کے لئے ہیں۔ اس سلسلہ میں کوئی توہم پرستانہ رسم اختیار نہ کرو۔ (۲/۱۸۹)۔

(۱۰) عام معاشرہ سے آگے بڑھ کر، حضورؐ نے خود اپنی ازواج مطہرات سے فرمایا کہ میرے گھر میں

(یہی قسم کی سادہ زندگی بسر کرنی ہوگی جیسی زندگی میں خود بسر کرتا ہوں)۔ اگر تم اس پر رضامند نہیں اور دنیوی ساز و سامان اور زیب و زینت کی زندگی چاہتی ہو تو میں تمہیں نہایت حسن کارانہ انداز سے رخصت کر دینے کے لئے تیار ہوں۔ اور اگر تم بطیب خاطر اس نہج کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو تو اس کا اجر بہت بڑا ہوگا۔ (تم دوسروں کے لئے نمونہ بنو گی)۔ (۳۳/۲۸ — ۲۹)۔

تمام نوعِ انسان سے خطاب

حضورؐ کی رسالت کسی خاص قوم یا ملک کے لئے نہیں تھی۔ تمام نوعِ انسان کے لئے تھی۔ اس لئے آپؐ نے عالمگیر انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

(۱) اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔ (۷/۱۵۸)۔

(۲) پھر فرمایا۔ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف حق آ گیا ہے۔ جو کوئی اس کی راہ نمائی قبول کرے گا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جو غلط راستے پر چلے گا، اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا۔ میں تم پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا جو تمہیں زبردستی صحیح راستے پر چلاؤں۔ (۱۰/۱۰۸) میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔ (۲۲/۷۹)۔

(۳) لیکن اگر تم یہ سمجھو کہ میں (خدا کی عبودیت چھوڑ کر) ان ہستیوں کی محکومیت اختیار کر لوں گا جنہیں تم نے اپنا الٰہ بنا رکھا ہے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ (۱۰/۱۰۴)۔

حضورؐ کی دعائیں

اس مجموعہ میں حضورؐ کی کچھ دعائیں بھی مذکور ہیں۔ مثلاً یہ کہ

(۱) اے میرے نشو و نما دینے والے! میرے علم میں اضافہ کئے جا۔ (۲۰/۱۱۴)۔

(۲) تو ہر تباہی سے میری حفاظت فرما۔ مجھے اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھ کہ اس قسم کا سایہ عاطفت اور کہیں سے میسر نہیں آ سکتا۔ (۲۳/۱۱۸)۔

(۳) اے میرے نشو و نما دینے والے! تو مجھے جہاں داخل کر صدق و صفا سے داخل کر۔ اور جہاں سے نکال صدق و صفا سے نکال۔ (۱۷/۸۰)۔

کس قدر حسین ہیں یہ دعائیں اور کیسی جنت در آغوش ہیں یہ آرزوئیں!

برادرانِ عزیز! یہ ہیں مجموعہ میں سے چند ایک "اقوالِ رسول اللہ" جن کے متن کے کسی ایک لفظ میں بھی کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ یہ مجموعہ میرے پاس موجود ہے۔ اور میں آپ کو اس کی زیارت کراؤں گا۔ سو یہ ہے میرے ہاتھ میں وہ مجموعہ۔ اور اس کا نام ہے قرآن مجید۔

لیکن آپ کہیں گے کہ قرآن مجید تو خدا کا کلام ہے۔ اس میں اقوالِ رسول اللہ کس طرح آ گئے؟ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ قرآن مجید شروع سے اخیر تک، لفظاً لفظاً خدا کا کلام ہے اور اس میں حضور نبی اکرمؐ کا اپنا ایک لفظ بھی نہیں اور جو کچھ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے وہ بھی قرآن کریم ہی کی آیات ہیں (جب یہ چھپ کر آپ کے سامنے آئیں گی تو وہاں آپ کو ان کا حوالہ بھی مل جائے گا)۔ لیکن یہ تمام آیات ایسی ہیں جن سے پہلے خدا نے حضورؐ سے کہا ہے کہ "قُلْ" "تو ایسا کہہ"۔ اس سے واضح ہے کہ قُلْ کے بعد وہ الفاظ ہیں جنہیں رسول اللہؐ نے دوسروں سے کہا۔ مثلاً جب خدا نے حضورؐ سے کہا کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ (۱۸/۱۱۰)۔ تو اس آیت میں اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں) وہ قرآنی الفاظ ہیں جو حضورؐ نے متکلم کے صیغے کے ساتھ دوسروں سے کہے تھے۔ لہٰذا اس اعتبار سے حدیث نبویؐ کی صحیح تعریف (DEFINITION) یہ ہے کہ قرآن کریم کی وہ آیات جن میں خدا نے رسول اللہؐ سے کہا کہ تو لوگوں سے ایسا کہہ۔ اور حضورؐ نے ویسا فرما دیا۔ یہی وہ "احادیث" ہیں جو وحی پر مبنی ہیں۔ جبریلِ امین جن کے راوی خود حضورؐ جن کے جامع اور خدا جن کا محافظ ہے۔ یہ لفظاً لفظاً ہم تک پہنچی ہیں اور کسی مسلمان کو ان کی صحت کے متعلق نہ کسی قسم کا شک و شبہ ہو سکتا نہ اختلاف و افتراق کی گنجائش۔ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے جو ارشادات، قرآن کے اندر نہیں آئے، ظاہر ہے کہ وہ وحی کا حصہ نہیں تھے۔ اسی لئے نہ حضورؐ نے انہیں مرتب فرما کر امت کو دیا۔ نہ خدا نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اسی لئے ان میں اس قدر اختلافات ہیں کہ اگر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کہتے ہیں کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کے انکار سے کفر لازم آ جاتا ہے تو دوسری طرف مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ بخاری کی ہر حدیث اس قابل نہیں کہ اسے جوں کا توں مان لیا جائے۔ ہم جسے صحیح سمجھیں گے اسے مانیں گے جسے صحیح نہیں سمجھیں گے اسے مسترد کر دیں گے لیکن قرآن کی کسی آیت کے متعلق وہ ایسا نہیں کہہ سکتے۔

یہ تو رہا احادیث کے اس حصے سے متعلق جسے "اقوال رسول اللہؐ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک اس حصہ کا تعلق ہے جسے افعال یا اعمالِ رسول اللہؐ کہہ کر پکارا جاتا ہے، جو قرآن کریم میں وہ حصہ اس کثرت سے آیا ہے کہ میں نے تیرے سائز کی قریب نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی سیرتِ نبویؐ پر مشتمل کتاب (معراج انسانیت)

انہی آیات کی بنیادوں پر مرتب (اور شائع) کی ہے۔ (اس کا نیا ایڈیشن طباعت کے لئے تیار ہے) لہٰذا اقوال و اعمالِ رسول اللہؐ دونوں قرآن کریم کے اندر ہیں اور یہی امت کے لئے اسوۂ حسنہ ہیں۔ باقی رہے حضورؐ کی سیرت سے متعلق تاریخی واقعات۔ سو ان میں سے جو قرآن کریم کے مطابق ہیں انہیں صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے جو اس کے خلاف ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔

مصطلح حدیث کے تیسرے حصہ کو "تقریر" کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے امور جو حضورؐ کے سامنے آئے لیکن آپ نے ان سے منع نہیں کیا۔ اب ظاہر ہے کہ جن امور سے آپ نے منع نہیں کیا یا سکوت فرمایا وہ دین کی رو سے ناجائز نہیں تھے۔ اس لئے قرآن کریم میں ان کے ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ قرآن کریم میں صرف ان امور کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق دین سے ہے۔ اور یہی وہ قرآن ہے جس کے متعلق وہ قرآنی "حدیث" ہمارے سامنے آتی ہے جس سے ہر مسلمان کا دل لرز جانا چاہیئے۔ وہ قرآنی "حدیث" یہ ہے کہ جب یہ امت خدا کے سامنے جائے گی تو

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ (۲۵/۳۰)

حضورؐ فریاد کریں گے کہ اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

حضورؐ کی اس فریاد میں، قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کے چھوڑ دینے کا ذکر نہیں، کہ قرآن ہی کے ساتھ تمسک سے دین قائم رہتا ہے اور اس کو چھوڑ دینے سے دامنِ دین ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

آخر میں، میں اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے قرآن کریم کی جو آیات پیش کی ہیں، وہ حرفاً حرفاً خدا کا کلام ہیں۔ رسول اللہؐ کا اپنا کلام نہیں۔ انہیں احادیث صرف یہ واضح کرنے کیلئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا کہ تم ایسا کہو۔ اور حضورؐ نے ویسا فرما دیا۔ یہی ہے کلام خداوندی کا وہ حصہ جسے صحیح ترین حدیث کہا جا سکتا ہے۔ اور یوں تو اگر سورۂ فاتحہ کی الحمد سے پہلے ایک لفظ قل کو محذوف مان لیا جائے تو سارے کا سارا قرآن اسی ذیل میں آجاتا ہے۔ یعنی کلام خداوندی جو قلب نبویؐ پر بالفاظہٖ نازل ہوا اور جسے حضورؐ نے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔

یہ ہے وہ مجموعہ احادیث جسے دینے کے بعد قرآن نے کہا تھا کہ

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ

اس کے بعد کونسی حدیث باقی رہ جاتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے؟

وَالسَّلَام

(اشرف پریس لاہور)

معراج انسانیت

پرویز

سیرتِ صاحبِ قرآن - خود قرآن کے آئینے میں
حسنِ سیرت کی رعنائیاں - خالقِ حسن کی نگاہ میں

- سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اس کی تشریح احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رو سے
- غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلل اور مسکت جواب
- دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کا خراجِ تحسین **بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں**

ایک انقلاب انگیز تصنیف ● ایک عہد آفریں کوشش ● عشق و خرد کا حسین امتزاج ●

بڑا سائز ● ضخامت قریب پانچسو صفحات ● کاغذ نہایت اعلیٰ ● جلد مضبوط ● گرد پوش جاذبِ نگاہ

● قیمت ● بیس روپے ● Rs. 20/-

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

مکتبہ دین و دانش - چوک اردو بازار - لاہور

لاہور سے

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات اور دیگر نامور مصنفین کی تصنیفات

مکتبہ دین و دانش

چوک اردو بازار لاہور